چشم تماشا
نجم الحسن رضوی

نجم الحسن رضوی

ماڈرن بک ڈپو، آبپارہ اسلام آباد

کتاب : ___ چشم تماشا

مصنف : ___ نجم الحسن رضوی

ناشر : ___ سید ذاکر شاہ ، ماڈرن بک ڈپو آبپارہ ، اسلام آباد

طابع ___ ایس ٹی پرنٹرز ، گوالمنڈی - راولپنڈی

طبع : ___ اگست ۱۹۸۲ء

خطاطی : ___ اعجاز کھوکھر

سرورق : ___ حمید ساغر

تعداد اشاعت ___ ایک ہزار

زرِ قیمت : ___ ۳۰/-

انتساب

اُن کے نام

— جنھوں نے مجھ سے محبّت کی
— جنھوں نے مجھ سے محبّت نہیں کی
— جن سے مجھے محبّت ہے

منظر نامہ

تعبیر

تصوّر

ہر حساس آدمی کی طرح مجھے بھی ہمیشہ محبت، حسن اور سچائی کی جستجو رہی ہے اور میرے شعور نے بالآخر یہی فیصلہ دیا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی لطیف حقیقت ہے جو چہرہ بدل بدل کے سامنے آتی ہے۔ میرے افسانے اس حقیقت کی مختلف صورتوں کا فنی عکس پیش کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی سچائیوں کی محض عکاسی کے بجائے میں نے انہیں فکر کے سانچے میں ڈھال کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایسی سچائیاں ہیں جنہوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا اور بعض ان میں ایسی سوچیں ہیں جنہیں میں نے زندہ حقیقتوں کی طرح دیکھا ہے۔

میں تازہ فنی اظہار پر یقین رکھتا ہوں۔ اظہار کا تعلق لفظوں سے ہوتا ہے جو لکھنے والے کا سرمایہ ہوتے ہیں لیکن میری رائے میں انہیں محض تمغوں کی طرح استعمال کرنا زیادتی ہے۔ لفظ پتھر ہوتے ہیں اور صرف معنی کی چمک ہی انہیں جواہر بناتی ہے اس لحاظ سے معنی آفرینی میرے لئے لفظ گری کی شرطِ اوّل ہے۔ یہ بات سارترؔ نے اس طرح کہی ہے کہ بڑا فنکار وہی ہے جو لفظوں کو اس طرح استعمال کرے کہ اپنی مرضی کے مطابق ان کو معنی پہنا سکے، روشنی دے سکے، بامقصد بنا سکے اور اپنی تحریر کو کبھی تو کوئی معنی دے اور کبھی کوئی اور ——— !

میں نہیں سمجھتا کہ معنوی گہرائی عطا کئے بغیر لفظوں کی غیر ضروری ملمع سازی سے کوئی نیا پن پیدا ہو سکتا ہے ویسے بھی ایک سچے تخلیق کار کے لئے نیا یا پرانا ہونا اتنا اہم نہیں ہونا چاہیئے جتنا کہ کامیاب اور موثر ہونا اور دیکھا جائے تو ہر وہ تخلیق نئی کہلانے کی مستحق ہوتی ہے جس میں زندگی کے کسی لمحے یا جذبے کی نئی تصویر اور نئی تعبیر پیش کی جائے اس میں اسلوب کا نیا پن بھی اہم ہے مگر فنکار کی اس آنکھ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو چہروں اور جذبوں کا کوئی نیا رخ دریافت کرتی ہے۔

طرزِ اظہار کے باب میں میرا خیال ہے کہ اشاریت کا استعمال اسے موثر اور خوبصورت بناتا ہے بشرطیکہ وہ ابلاغ کی راہ میں حائل نہ ہو۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو افسانے میں علامت کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ علامت میری کمزوری نہیں، طاقت ہے جسے میں نے اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے کے لئے استعمال کیا ہے۔

قاری سے بے اعتنائی میرا شعار نہیں اس لئے میں پورے تخلیقی عمل کو ترسیلِ خیال کی ایک تکون سمجھتا ہوں جس کے ایک سرے پر تخلیق کار ہوتا ہے دوسرے پر تخلیق اور تیسرے پر قاری! بہترین اور کامیاب تخلیقی عمل وہی ہے جس میں یہ تینوں برابری کے ساتھ ترسیلِ خیال کے عمل میں شریک ہوں ورنہ سارا تخلیقی عمل گڑبڑ ہو جاتا ہے اور پھر چھپنا یا نہ چھپنا برابر سمجھئے۔ دراصل کوئی تخلیق جینا ہی اسی وقت شروع کرتی ہے جب اسے پڑھا جاتا ہے اسی لئے تو ایک ہم عصر چینی ناول نگار یاؤ سوئے ین نے کہا ہے کہ ادیب کو ضرور چھپنا چاہیئے کیونکہ اس کے لئے نہ چھپنے سے بڑی اذیت کوئی اور نہیں ہو سکتی گویا ہر تحریر کے لئے لازمی ہے کہ وہ قاری تک ضرور پہنچے لیکن اگر قاری کی آنکھ کسی چھپی ہوئی تحریر کو کوشش کے باوجود دریافت کرنے سے قاصر رہے تو یہ مسئلہ بھی ادیب کے لئے اتنا ہی اذیت ناک ہونا چاہیئے جتنا کہ نہ چھپنا!

میں چونکہ چھپنے کے لئے لکھنے کو ایک سماجی عمل سمجھتا ہوں لہٰذا قاری کے نقطۂ نظر کو لکھنے والوں کی انا سے ہرگز متصادم نہیں پاتا اور اس لئے افسانے کی صنف سے قاری کے اس مطالبے کو جائز سمجھتا ہوں کہ اسے پُرمعنی ہونے کے باوجود غیر مبہم، دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہونا چاہیئے لیکن یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ نیا افسانہ بھی نئے قاری کا طلبگار رہے، ایسے چاق و چوبند قاری کا، جو سونے کے بجائے جاگنے کے لئے کہانی پڑھتا ہو کیونکہ آج پہلے کی طرح نہ تو کہانی برائے کہانی لکھی جاتی ہے جس میں صرف اکہرا قصہ یا واقعات دھارا اہمیت رکھتا تھا نہ اب کہانی محض بیانیہ ہے کہ جس میں نظریئے کی بازگشت ہی سب سے اہم ہو، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افسانہ اب پہلے کی نسبت زیادہ پُرمعنی، فکر انگیز اور ہمہ جہت ہو گیا ہے جس کے ذریعے

نہایت کامیابی کے ساتھ ان دو دنیاؤں کے درمیان تخلیقی تفکر کا پُل تعمیر کیا جا سکتا ہے جو انسان کے اندر اور باہر پھیلی ہوئی ہیں اور میری نظر میں یہی فکری سطح نئے افسانے کو روایتی افسانے سے جُدا کرتی ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ ترقی پسندوں سے جس افسانے نے دیکھنا اور بولنا سیکھا تھا وہ اب باقاعدہ سوچنے لگا ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود میرے نزدیک کسی افسانے کی مثالی خوبی یہ ہونی چاہیئے کہ اسے دو سطحوں پر پڑھا جا سکے، ایک تو عام سطح پر جہاں وہ واقعاتی دلچسپی کی بناء پر پڑھ لیا جائے اور دوسری خالص فکری سطح پر جہاں وہ عام سطح سے بلند ہو کر اپنے علامتی مفہوم تک پہنچنے کی سعی کرے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میرے افسانے ان دونوں سطحوں پر پڑھے جا سکیں۔ چونکہ میں زندگی کی ہر گیریت کی نقش گری پر یقین رکھتا ہوں لہذا میرے افسانوں میں اسلوب کی رنگا رنگی ایک لازمی امر ہے۔ یک رنگی اور یکسانی مجھے اکتا دیتی ہے ویسے بھی تصورات کوئی مویشی نہیں ہیں کہ انہیں ایک لاٹھی سے ہانک دیا جائے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ موضوع کی مناسبت سے پیرائے اظہار اختیار کیا جائے اور وہ ایسا ہو کہ جس سے بعض پرانے موضوعات نئے اور بہت سے بالکل نامانوس موضوعات مانوس نظر آنے لگیں۔ میرے لئے سب سے زیادہ اہم چیز زندگی سے وابستگی ہے اور میرے افسانوں میں جو زندگی آپ کو سانس لیتی نظر آئے گی وہ بھی وطنِ عزیز کی عطر بیز ہوا کی طرح ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ یہ مجموعہ قدرے دیر سے شائع ہو رہا ہے اگرچہ میں خاصے عرصے سے لکھ رہا ہوں لیکن اگر ان افسانوں میں خود کو پڑھوانے کی صلاحیت موجود ہے تو میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھوں گا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ایک عرصے تک اپنے آپ سے باتیں کرتے کرتے اب آپ سے باتیں کرنے کے قابل ہو گیا ہوں۔

نجم الحسن رضوی

تصویر

نجم الحسن رضوی کی شخصیت میں بے چینی اور جلد بازی کے وہ عناصر دکھائی نہ دیئے جو اب تو اس کے گرد و پیش کا خاصہ بن چکے ہیں۔ مجھے تو وہ اپنے ہی لکھے ہوئے لفظوں کی طرح بہت ہی پُرسکون اور چپ چاپ مگن دکھائی دیا ہے

احمد جاوید

نجم الحسن رضوی اپنی صورت اور سیرت کے اعتبار سے مرنجاں مرنج قسم کی ہستی ہے لیکن اس کی کہانیاں اس کی شخصیت سے قطعی مختلف ہیں۔ وہ اپنے شخصی رویّے میں شریف شہری ہے لیکن اپنی کہانیوں میں وہ ان تضادات کو موضوع بناتا ہے جو فنکار کے انفرادی کرب کا باعث ہوتے ہیں مجھ میں اور اس میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں سوائے اس فنکارانہ کرب کے جو اس عہد کی عطا ہے اور جس کا اظہار وہ اپنی کہانیوں میں کرتا ہے۔

احمد داؤد

وہ شکل سے آدمی لگتا ہے مگر اندر سے مکمل انسان ہے۔ سب کا دوست ہے مگر گو میڈ ٹو۔ بظاہر افسانے میں کرخت ہے مگر باطن میں شعری حلاوت ——— اور یہ نجم الحسن رضوی ہے۔

اعجاز راہی

رضوی ہلکے رنگ پسند کرتا ہے۔ دھیمے لہجے میں بولتا ہے۔ خوش ہو تو اکثر مسکراتا ہے جس سے بے تکلف ہو اس کے ساتھ مل کر محتاط قہقہے لگاتا ہے۔ مگر بے تکلف ہونے میں بڑا کفایت شعار ہے۔ اپنے باطنی ظلمات کو اپنی سنجیدگی میں لپیٹے رکھتا ہے ——— اور کہانیوں میں ظاہر کرتا ہے۔

حمید ساغر

نجم الحسن دیکھنے میں ایک دبلا پتلا، اوسط سے ذرا اونچے قد کا، خاموش طبع، سلجھے ہوئے مذاق کا تعلیم یافتہ نوجوان افسانہ نگار ہے۔ کھلتی ہوئی رنگت کے کتابی چہرے پر سنجیدگی اور متانت چھائی ہوئی ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ بور کرے۔ خندہ پیشانی گھنی بھنویں تلے۔ ذہانت سے پُر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گفتگو میں پختگی، شگفتگی اور نکھار۔ نہایت دلچسپ اسلوب طرز کے افسانے لکھتا ہے جن میں گہرائی، گیرائی، علامت، اشاریت اور ڈرامائیت پائی جاتی ہے۔

رخسانہ شاہ عزیز

نجم الحسن رضوی ایک درویش دوست ہے۔ اس کے عجز اور انکساری نے اس کی شخصیت میں ایک عجیب دبازت پیدا کر دی ہے اور یہ دبازت اس کی ہمیشہ چپکنے والی مسکراہٹ کی شکل میں اس کی پہچان بن گئی ہے۔ اس کی خود اعتمادی بھی اسی درویشی کی دین ہے، یہ خود اعتمادی اس کے فن کی اساس بھی ہے اور اس کی کہانیوں کی پہچان بھی۔ — رشید امجد

نجم الحسن رضوی ہم عصر افسانہ نگاروں کی باہمی پیکار میں "NO MAN'S LAND" ہے۔ جس تک آتے آتے میں نے ہمیشہ اپنی معلّقہ تلوار کو نگوں پایا۔ وہ ایک ایسا شاداب خطہ ہے جس کی تخلیقی ہریالی میرے لئے ہمیشہ قابلِ رشک رہی۔

مرزا حامد بیگ

کسی ٹی ہاؤس میں ادیب دوستوں کی محفل میں بیٹھا کوئی ایسا جوان (نوجوان نہیں) نظر آئے جو بات کہنے سے پہلے اتنی دیر تو لے کہ زیرِ بحث موضوع ہی بدل چکا ہو اور وہ پھر بولنے کی کوشش میں سر کو نفی میں اثبات میں ہلاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ نجم الحسن رضوی ہے۔ وہ دوسروں کی باتیں دھیان سے یوں سنتا ہے جیسے کونین کو شربت نیلوفر میں ملا کر پی رہا ہو۔ اگر کسی کو نجم الحسن رضوی کے بھید کا حال جاننا ہو تو عینک کے پیچھے چھپی اس کی آنکھوں کو پڑھے یہی آنکھیں تماشا بھی ہیں اور تماشا گر بھی ——— اس کی یہی دوستی اسے ایسے ایسے منفرد افسانے لکھواتی ہے کہ میں کہا کرتا ہوں کہ نجم الحسن کی باتوں میں جتنی ملاحت ہے اس کے قلم میں اتنی ہی جراحت ہے۔

منشور قیصر

نجم الحسن رضوی نہ صرف اوّل درجے کا افسانہ نگار ہے بلکہ وہ اوّل درجے کا انسان بھی ہے۔ وہ انسانی تعلقات اور فنی معاملات دونوں میں توازن کا دلدادہ ہے میں اسے اس کے فن اور شخصیت دونوں کے حوالے سے محبتوں کا سفیر کہتا ہوں

محمد منشا یاد

تماشا

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

حوّا، سانتا کلاز اور تاج محل

اس نے اچانک کسی خوبصورت راز کی طرح اپنے نازک ہاتھ میلے دستانوں سے باہر نکالے اور درخت پر بیٹھے ہوئے برف کے کبوتر اڑاتے ہوئے کہا —— "تو کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے جنگلوں میں ایسے ریچھ ہوتے ہیں جو عورتوں کو اٹھائے جاتے ہیں؟"

ریچھ..... جنگل..... عورتیں؟ میں حیرت سے اس دوشیزۂ طناز کا منہ تکنے لگا۔

اس نے میری حیرت بھانپ کے کہا —— "ہاں میں نے کہیں پڑھا تھا، ایشیائی کہانیوں کے کسی مجموعے میں کہ..... !"

"کس لئے خاتون، آخر کیوں؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ریچھ ہم مردوں کی طرح اتنے بیوقوف ہوتے ہوں گے!" میں ہنسا۔

"ہاہا —— برادر کیا نکتہ پیدا کیا ہے!" جیک نے زور کا قہقہہ لگایا اور حشیش کا ایک گرم مرطوب بھبکا فی البدیہہ اس کے منہ سے نکل کر میرے چہرے سے ٹکرایا۔ اس نے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے برادر کہ یہ جو فیمر سیکس ہوتی ہے نا بڑی ہی ظالم مخلوق ہوتی ہے بالکل ان فیئر (UNFAIR) اچھے خاصے آدمی کو الّو کا پٹھا بنا دیتی ہے۔ اب انہی صاحبزادی کو دیکھ لو، نام ہے ان کا سلاسٹ (CELEST) یعنی کچھ آسمانی اور آفاقی سی شے مگر کرتوت بڑی بی کے بالکل شیطانی ہیں۔ جناب ان سے میرا پہلا تصادم نیویارک میں ہوا، ایک بس کے

اندر ـــــ بس جی گلے کا ہار ہو گئیں ـــ اب یہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں، میں جہاں بھی گیا، آسٹریلیا، جاپان، نیو آئی لینڈ، ویت نام، تھائی لینڈ اور اس طرف ترکی اور ایران ـــــ ہر جگہ موصوفہ میری دُم کے پیچھے پیچھے ـــــ کوئی ان سے پوچھے، بی بی کب قصور معاف کرو گی ـــــ لیکن ان کا بس وہی ایک جواب کہ جہاں تم وہاں ہم ـــ" جیک نے یہ کہہ کر ہوا میں لہراتی داڑھی کو انگلیوں سے سنوارا اور پھر پتلون کی جیب میں حشیش کا کوئی بھولا بسرا ٹکڑا ٹٹولنے لگا۔

سلاسٹ نے ننھا سا برف کا بڑا سا گولا جیک کو مارا جو اس کے سر پر بندھے ہوئے سفید عمامے سے ٹکرا کر بکھر گیا۔ سلاسٹ نے کہا ـــــ "میں تمہارے ساتھ آئی ہوں اور تمہارے ساتھ ہی رہوں گی، دیکھتی ہوں تم کب تک سفر کئے جاتے ہو ـــ اور سنو آدم نے حوا کی خاطر جنت چھوڑ دی تھی، اب اگر آج ایک حوا کی بیٹی آدم کے بیٹے کے لئے اپنا گھر چھوڑ دے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے ـــــ کیوں دمن؟"

میں نے کہا ـــ "ٹھیک کہا تم نے ـــ اچھا بی بی یہ بتاؤ تمہیں بھوک تو نہیں لگی، ابھی تک عشرت نہیں لوٹا۔ وہ سامنے والے ہوٹل میں خوراک کی امداد کے سوال پر مذاکرات کرنے گیا تھا۔"

سلاسٹ نے جواب دیا ـــ "بھوک تو لگی ہے، تمہیں پتہ ہے رات ہم نے صرف سوپ پیا تھا، صبح ہوٹل میں آلو کے قتلے کھائے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ کھا نہیں سکتے تھے کیونکہ فردوسی ہوٹل والا خرانٹ بوڑھا بس اسی تاک میں تھا کہ بل نہ ادا کر سکنے کی پاداش میں کب مجھے دبوچ لے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارے دوست سے ملاقات ہو گئی کیا نام ہے ان کا؟ ـــ ہاں مسٹر ایش رت!"

"آلش رت نہیں، عشرت — میں نے تصحیح کی۔

سلاسٹ بولی — "عشرت بہت مہمان نواز ہیں۔ ہم لوگ ناک کی سیدھ میں جا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے آواز دی۔ جیک سے ہاتھ ملایا اور اپنی گاڑی میں لفٹ دی۔ واقعی وہ بہت اچھے آدمی ہیں — ان کا گھر بہت اچھا ہے — کیوں جیک؟"

جیک نے حشیش کے ایک سبز ٹکڑے کو دیا سلائی کی تیلی سے جلایا اور اس کی راکھ کو ہتھیلی پر رگڑتے ہوئے کہا — "اوہ یس ڈیئر — کیا شاندار گھر ہے آج ہم لوگ وہیں تو ٹھہریں گے۔ آپ بھی آئیں نا برادر — خوب محفل جمے گی۔"

وہ سگریٹ کھوکھلا کر کے اس میں حشیش بھرنے لگا۔ اسی وقت عشرت صاحب نازل ہوئے ان کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے لفافے تھے۔ "ہیلو ایوری باڈی" عشرت نے کہا بڑی مشکل سے ڈبل روٹی، بالٹی گوشت اور کچھ اچار دستیاب ہوا ہے، ہوٹل والا کہتا ہے کہ اس شدید سردی اور برف باری میں کون شریف آدمی اِدھر کا رُخ کرتا ہے۔ گویا ہم لوگ اس کی نظر میں بھٹکی ہوئی روحیں ہیں! وہ ہنسا۔

جیک نے عشرت کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا — "ٹھیک تو ہے برادر، ہم لوگ بھٹکی ہوئی روحیں نہیں ہیں کیا؟ واقعی ہمیں قرار کی ضرورت ہے، چین اور سکون کی، سوچنے کے وقفے کی۔" پھر اس نے سگریٹ میری طرف بڑھایا — "چاہیئے؟" میں ہچکچایا۔ جیک نے کہا — "ارے برادر ایک کش تو لگاؤ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ ہم جوگیوں کی صحبت میں خود کشی کا ایک لمحہ دیکھا تھا!"

میں نے کہا — "نہیں بھائی میں کوئی چیز نہیں پیتا — سگریٹ، شراب نہ چرس — شکریہ!"

جیک نے اپنی داڑھی کو تفکر آمیز جنبش دے کر خاصی تشویش سے کہا۔ "اسے مرد آدمی، پھر جیتے کیسے ہو! تمہیں پتہ نہیں یہ کیسی متبرک چیز ہے؟ اس کے پینے سے آدمی کو مکمل نروان نصیب ہوتا ہے، ویسے بھی حشیش اور مرجوانا میں فرق ہے، مرجوانا سلاتی ہے، جب کہ حشیش آدمی کو بیدار کرتی ہے، ذہن و دل کے بند دریچے کھولتی ہے برادر مت بھولو کہ اسے ٹھکرا کے تم فکر کے پہاڑ کی چوٹی سر کرنے سے گریز کر رہے ہو ـــــ افسوس!"

اتنے میں سیلاسٹ نے جیک کے لبوں سے سگریٹ اُچک لیا۔ "جان من مجھے تو نہ بھولو، ایک کش ادھر بھی ـــــ؟"

اسی وقت عشرت نے جھیل کے کنارے بنے ہوئے سائبان کے نیچے میز پر لفافے رکھ دیئے ـــــ "تکلف برطرف حاضر ہیں   نوش فرمایئے!" وہ دونوں تیزی کے ساتھ لفافوں پر لپکے، نیچے حبہ جھیل پر تنی ہوئی برف کی جھلی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ عشرت نے برف کے گالوں کو ناچتے ہوئے جھیل پر اُترتے دیکھا اور مجھے ٹہوکا دے کر کہا۔ "کتنا خوبصورت موسم ہے اس کا جشن مناؤ دوست، ورنہ بدذوق کہلاؤ گے!"

سیلاسٹ نے گوشت کا بڑا سا ٹکڑا نگلتے ہوئے کہا۔ "تمہارا شہر بہت خوبصورت ہے، چھوٹا، پرسکون اور بارونق ـــــ مگر سردی؟ ـــــ غضب خدا کا!" ـــــ پھر اس نے جیک کی طرف دیکھ کے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اگر جیک میرے ساتھ نہ ہوتا تو پتہ نہیں کیا حشر ہوتا میرا ـــــ جانتے ہو فردوسی ہوٹل میں انگیٹھیوں میں جو کوئلہ جلتا تھا اس میں سے گندھک کی ایسی بُو اٹھتی تھی کہ مجھے کئی بار قے ہو گئی۔"

عشرت بولا "خیر تمہیں آج یہ تکلیف نہیں ہو گی ـــــ میرے یہاں کمرے بھی

گرم ہیں اور دل بھی!"

سیلاسٹ نے خوشی سے کہا ــــ "تم بھی ضرور آنا رحمٰن ــــ بڑا مزا آئے گا ــــ اور میں تمہیں رات میں بائبل کا ایک باب سناؤں گی!"

عشرت نے کہا ــــ "یہ آئے گا جب کہ جائے گا ــــ پر یہ جائے گا کہاں؟ اور بھلا اسے کون جانے دے گا ــــ سب ساتھ ہی چلتے ہیں ــــ ویسے بھی ہم پڑوسی ہیں اور ہمارے گھروں کے بیچ میں صرف ایک دیوار ہی تو ہے!"

جیک نے سر جھکا کے فلسفیوں کی سی سنجیدگی سے کہا ــــ "خدا نہ کرے کہ کبھی تم دونوں کے بیچ دیوار آئے!"

اور اُس رات ہم سب عشرت کی دیوار کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے، اسٹو و نے کمرے کو خوب گرم کر رکھا تھا اور جیک قالین پر اوندھے منہ لیٹا ہوا امریکی ملاحوں کا گیت الاپ رہا تھا۔ اس کی نیلی جین گھٹنے پر سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کا سفید عمامہ ایک طرف ڈھیر تھا۔ عشرت نے پوچھا ــــ "تم نے یہ عمامہ کہاں سے ہتھیایا ظالم؟ ویسے بجتا خوب ہے تمہارے اوپر!"

جیک اٹھ کے بیٹھ گیا ــــ "یہ ــــ یہ مجھے کابل میں ایک دوست نے تحفے میں دیا تھا!"

عشرت نے کہا ــــ "میں بھی تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں، بولو کیا دوں؟"

جیک نے کہا ــــ "سچ؟ اچھا تو سنو میں نے کل یہاں کتابوں کی کسی دوکان پر ایک کتاب دیکھی تھی کلاسیکی موسیقی پر، مجھے وہ کتاب لا دو ــــ ٹھیک ہے؟"

"کتاب ــــ؟" عشرت نے حیرت سے پوچھا ــــ "تمہیں کتاب چاہیئے؟"

"ہاں کیوں نہیں ــــ جیک بولا ــــ میرا وہ تھیلا دیکھ رہے ہو" اس نے کونے میں رکھے ہوئے ایک گول سفری تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔" اس میں صرف کتابیں ہیں" اس نے لپک کے تھیلا اٹھایا اور قالین پر الٹ دیا۔ بہت سی کتابیں تھیلے سے نکل کے قالین پر بکھر گئیں "میں نے یہ کتاب کٹھمنڈو میں خریدی تھی ــــ" اس نے گوتم بدھ پر ایک کتاب دکھائی"۔ اور یہ بھگوت گیتا کا ایک نسخہ میرے پاس پہلے کا ہے ــــ اور ہاں یہ کتاب دیکھو ــــ کاما سترا ــــ مذہب عشق کی آسمانی کتاب ــــ یہ میں نے دہلی میں خریدی تھی" پھر اس نے ایک اور کتاب اٹھائی ــــ اور لو بھئی یہ عہد نامۂ جدید، یہ سلاسٹ کی پسندیدہ کتاب ہے ــــ کیوں سلاسٹ" اس نے سلاسٹ کو مخاطب کیا۔

سلاسٹ نے کہا ــــ "ہاں ــــ اور میں روز سونے سے پہلے اس کا ایک باب پڑھ کے سوتی ہوں" اس نے جیک کے ہاتھ سے بائبل لے لی۔

عشرت کتابوں کی ریل پیل سے کچھ اکتا سا گیا تھا اس نے جیب سے ڈن ہل کا پیکٹ نکالا "سگریٹ پیو"!

سلاسٹ نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا ــــ "اوہ ــــ ڈ...ا... ن ہل ــــ دِس اِز گریٹ! لاؤ ایک سگریٹ مجھے بھی دو" وہ بائبل گھٹنوں پر رکھ کے آگے کو جھکی۔

عشرت نے پورا پیکٹ اس کے حوالے کر دیا "یہ سب تمہارے لئے ہیں"!

سلاسٹ نے کمال پھرتی سے ایک سگریٹ ہونٹوں سے لگا کے سلگائی اور کہا "برا نہ ماننا ڈن ہل میری کمزوری ہے"

جیک نے شوخی سے کہا "اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ خوبصورت عورت سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے مطلب ــــ ارے توبہ! یقین کرو بھئی ــــ

تمہارے ساتھ مجھے زندہ سلامت دیکھ کے لوگ میری سخت جانی کے قائل ہو جاتے ہیں"!

وہ پھر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنے کولھے سلاآسٹ کی طرف موڑ کے بولا — میری پتلون کے پیندے میں ایک ناہنجار روشندان کھل گیا ہے ذرا اس میں سیفٹی پن تو لگا دو"

سلاآسٹ نے کہا — "اوہ ڈیئر! خدا کے لئے اب تم اس نحوست مارے ٹراؤزر کو الوداع کہہ دو ورنہ میری سیفٹی پنوں کا سارا اسٹاک ختم ہو جائے گا، آخر تم اپنے لئے کوئی نیا؟"

جیک نے منہ پھیر کے سلاآسٹ کی جھکی ہوئی گردن پر اپنی داڑھی کے نرم برش سے گدگدی کی اور اٹھلا کے بولا" اوں ہونہہ — پہلے تو میں تمہارے لئے بلوچی کشیدہ کاری کا گاچ خریدوں گا!"

سلاسٹ کھکھلا اٹھی — "اوہ ڈیئر کیا سچ؟"

عشرت نے کہا — "کل تم لوگ میرے ساتھ چلنا، یہ تحفہ بھی میری طرف سے ہوگا!"

جیک اپنے گلے میں پڑی ہوئی کانچ کے موٹے موٹے موتیوں کی مالا چھو کے بولا —" لو بھئی یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہمارے معزز دوست مہمان نوازی میں اس قدر عظیم جذبات کا اظہار کریں گے!"

عشرت نے سینہ پھلا کے کہا — "ہماری روایات کے مطابق مہمانوں کی ہمارے یہاں ایسی ہی ناز برداری ہوتی ہے — کیا سمجھے؟"

"سمجھ گیا — جیک نے دیدے گھمائے "مگر ایک بات سنو، اگر یہ جذبہ برقرار رکھنا چاہتے ہو تو کوشش کرو کہ بستیاں اپنی حدود سے نکلنے نہ پائیں، شہروں کو کینسر کی طرح پھیلنے اور عمارتوں کو اپنا قد نہ بڑھانے دو ورنہ یاد رکھو برادر تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو ان لوگوں کا ہوا جہاں سے ہم لوگ بھاگ کے آئے ہیں! شاید تمہیں پتہ نہیں میں پہلے ایک ایمبولنس ڈرائیور تھا پھر مجھے ویت نام بھیج دیا گیا، جہاں میں نے تین سال گزارے۔ پھر جب میں واپس گھر لوٹا تو وہاں

میری ملاقات ان صاحبہ سے ہوئی۔ یہ ایک اسکول میں پڑھاتی تھیں ـــــ بچوں کو پڑھاتی تھیں بیچاری، حالانکہ میرا خیال ہے برادر کہ وہاں بچوں سے زیادہ بڑوں کی تعلیم ضروری ہے کیونکہ وہاں سب بڑے اپنا سارا پچھلا سبق بھول گئے ہیں۔ مشینوں کے شور نے اسفنج کی طرح ان کے ذہن کی سلیٹ بالکل صاف کر دی ہے ـــــ بے چارے لوگ!"

عشرت نے سلاسٹ سے پوچھا ـــ "تم کیا پڑھاتی تھیں؟"

سلاسٹ نے کہا ـــ "فرانسیسی!"

"کیا مطلب؟" عشرت نے کہا۔

جیک بولا ـــ "یہ بیچاری سوربورن یونیورسٹی کی گریجویٹ ہیں اور فرانسیسی انگریزی سے اچھی بولتی ہیں حالانکہ ان کی والدہ محترمہ نے ایک انگریز گھرانے میں پیدا ہونے کی غلطی کی تھی۔"

سلاسٹ نے کہا ـــ "رفی آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ تاسف سے کہنے لگی ـــ "فرانسیسی بڑی طاقتور زبان ہے اور اس کا ادب! اچھا تم نے ترجمے تو ضرور پڑھے ہوں گے؟"

میں نے دو ایک فرانسیسی ادیبوں اور شاعروں کے نام لئے تو وہ کھل اٹھی ـــ "او ہو تم تو باذوق آدمی معلوم ہوتے ہو؟"

عشرت نے کہا ـــ "یہ خود بھی لکھنے کے مرض میں مبتلا ہیں بی بی اور کوئی بات نہیں۔"

"سچ؟" ـــ سلاسٹ کی آنکھیں چمک اٹھیں ـــ "تو کیا تم کہانیاں لکھتے ہو؟"

میں نے اقبالِ جرم کیا تو وہ کہنے لگی ـــ "کاش میں تمہاری کہانیاں پڑھ سکتی، مجھے کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے ـــ!" وہ مجھے اشتیاق سے تکتی رہی پھر بولی ـــ "اچھا تمہاری کہانیوں کا موضوع ـــ؟"

"بس بس خدارا اس سے آگے نہ بڑھیں ــــ" عشرت بیچ میں کود پڑا۔"فی الحال گفتگو اپنی کہانی تک محدود رکھئے ــــ ہم لوگ بس اس کہانی میں دلچسپی رکھتے ہیں جو آپ کی ذات سے متعلق ہو۔"

سلاسٹ نے جیک کی طرف دیکھا۔ اس کا سر نیند سے بوجھل ہو کے سینے پر جھول گیا تھا ــــ "ارے ارے تم تو سونے لگے ــــ" سلاسٹ نے جیک کے شانے کو ہلایا۔ "ابھی تو میں بائبل کا ایک باب سناؤں گی ــــ ذرا بستر تو بچھا لو۔"

جیک نے ایک آنکھ کھول کے زور کی جمائی لی اور سر کھجا کے بولا ــــ "آج بائبل کی چھٹی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں ــــ" سلاسٹ نے کہا ــــ "میں بائبل تو ضرور پڑھوں گی۔ تم ذرا بستر تو بچھاؤ!"

جیک لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور اپنے میلے کچیلے بستروں کا بنڈل کھول کے سلا متعفن گودڑ قالین پر پھیلا دیا۔ پھر سلاسٹ نے بائبل کھولی اور بلند آواز میں یسوع مسیح کا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؛ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے اس لئے فکرمند ہو کے یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے، کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ کیونکہ ان سب چیزوں کے محتاج ہو، بلکہ تم پہلے اس کی پادشاہی

اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں تم کو مل جائیں گی پس کل کے لئے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لئے آپ فکر کرے گا، آج کے لئے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔"

سلاسٹ نے بائبل سے نظر اٹھا کے جیک کو دیکھا جو اپنے چوتھائی بدن پر لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔اس نے بائبل بند کر دی اور کہا ——"جیک ان لوگوں میں سے ہے۔ جو آج کا دکھ بھی نہیں اٹھاتے اور یہ مجھے اسی لئے اس قدر عزیز ہے!" اس نے پیار سے جیک کے پاؤں سیدھے کئے، اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور اس کے بدن کو گندے لحاف سے ڈھانک کے بولی ——"آج بس اتنی ہی بائبل کافی ہے، باقی کل!"

پتہ نہیں رات کا کونسا پہر تھا کہ کال بیل زور سے چیخی اور ساتھ ہی پڑوس کے کتے نے اپنا بھونپو بجایا۔میں ہڑبڑا کے باہر نکلا۔گیٹ پر جیک اور سلاسٹ کھڑے تھے۔جیک کے اوپر سارا سامان لدا ہوا تھا، سفری تھیلے اور کینوس کے بستر۔اس کی آنکھوں کے نیم وا دریچوں سے نیند جھانک رہی تھی۔سلاسٹ اپنے مختصر سے شب خوابی کے لباس پر جیک کی میلی اونی جرسی لپیٹے ہوئے تھی۔جیک مجھے دیکھتے ہی نیند کی غنودگی میں بڑبڑایا۔"ہم رات تمہارے یہاں بسر کریں گے برادر، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

میں نے کہا ——"نہیں نہیں آؤ، مگر یہ آدھی رات کو ہجرت کیسی؟"

سلاسٹ نے کچھ نہ کہا اور وہ پھاٹک کے گیٹ کے اندر آ گئی۔اس کا بدن سردی سے کانپ رہا تھا۔جیک نے اپنی کتابوں کا وزنی تھیلا مجھے تھمایا ——"اگر تم برا نہ مانو!" پھر وہ گرم کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تکلفی سے میرے بستر پر گر پڑا ——"برادر ذرا ایک سگریٹ تو دینا!"

سلاسٹ نے فرش پر اپنا بستر کھول دیا اور خاموشی سے جوتے اتارنے لگی جو برف

میں چلنے سے گیلے ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ سردی سے نیلا ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "دو تو گرم کافی چلے گی؟" "تکلف کی بالکل ضرورت نہیں۔ بالکل سامنے باورچی خانہ ہے، بس دو منٹ لگیں گے!"

سلاتسٹ نے کہا۔ "کچن مجھے دکھا دیں، باقی کام میں خود کر لوں گی!"

میں نے اشارے سے راستہ بتایا تو وہ کچن میں چلی گئی۔ میں نے جیک کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جو سگریٹ کا ایک تہائی حصہ کھوکھلا کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے کہا "میں تمہاری نگاہوں کا مطلب سمجھتا ہوں برادر لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں، میں تو گھوڑے بیچ کے سو رہا تھا کہ اچانک سلاتسٹ نے جگایا اور کہا کہ یہاں سے ابھی چلو!"

"بس یہی بات تھی؟" میں نے اسے متجسس نگاہوں سے ٹٹولا۔

جیک نے اطمینان سے سگریٹ میں حشیش بھرتے ہوئے کہا۔ "میری ذات سے بس اس کا اتنا ہی تعلق ہے!" اسی وقت سلاتسٹ کمرے میں آئی۔ "ہاں اس کا تعلق میری ذات سے ہے!" اس نے میز پر کافی کی پیالیاں سجاتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تمہیں ناوقت پریشان کیا برفی لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا ورنہ شاید تمہارے دوست کی مہمان نوازی مجھے بہت مہنگی پڑتی!"

"کیا۔۔۔؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "کچھ اس نے تم سے کہا؟"

سلاتسٹ نے نظریں جھکا لیں۔ "بہت کچھ۔۔۔!" وہ پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کرید کے بولی۔ پھر وہ ہمیں کافی کی پیالیاں تھماتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم بتاؤ برفی اگر کوئی مجھ سے جیک کے متعلق یہ کہے کہ وہ بوڑھا اور ناکارہ ہے تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟"

جیک نے کہا۔ "ہر شخص کو رائے رکھنے کا حق ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں!"

سلاسٹ نے تیزی سے کہا۔ "نہیں مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی بے ضرر رائے نہیں تھی۔ وہ جیک سے حسد کرنے لگا تھا۔" پھر اس نے گردن جھٹکا کے کہا۔ "دراصل وہ میرے بستر سے جیک کے بدن کی گرمی چرانا چاہتا تھا۔"

جیک نے نرمی سے کہا۔۔۔ "اوہ تم تو شاعر ہو سلاسٹ، مگر میرے خیال میں اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا!"

"نہیں ضرور تھا۔۔۔" سلاسٹ نے جھلا کے جواب دیا۔۔۔ "یہ دیکھو!" اس نے ایک چمکدار انگوٹھی دکھائی۔ "اس نے مجھے یہ انگوٹھی بھی دی اور کہا اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے!"

جیک نے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لے لی۔۔۔ "لاؤ یہ انگوٹھی مجھے دے دو میں اسے صبح واپس کر دوں گا۔۔۔ اور ہاں دیکھو اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ بس ابھی بچوں کی طرح آنکھیں موند کے بستر پر لیٹ جاؤ!"

دوسرے دن صبح ابھی ہم لوگ بمشکل ناشتے سے نمٹے تھے کہ عشرت کی گاڑی آ کے رُکی۔ اندر داخل ہوتے ہی جیسے ہی اس کی نظر جیک اور سلاسٹ پر پڑی اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اوہو۔۔۔" اس نے ہونٹ سکوڑ کے سیٹی بجائی، "تو گویا میرے مغرور مہمان یہاں قیام پذیر ہیں!" پھر وہ سلاسٹ سے مخاطب ہوا۔۔۔ "کیوں صاحب ایسی بھی کیا بے رخی کہ بغیر الوداع کہے چلی آئیں!"

سلاسٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔۔۔ "پتہ نہیں بعض لوگوں کے بدن سے ریچھ کی بو کیوں آتی ہے، تمہیں معلوم ہے رفعی؟"

جیک نے اپنی جیب سے انگوٹھی نکال کر عشرت کی طرف بڑھائی۔ "آپ کی انگوٹھی

محترم، امید ہے جناب کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے!

پھر سلاآسٹ قالین پر جیک کے پہلو میں لیٹ گئی اور جیک نے ہم لوگوں کی موجودگی سے قطعی بے نیاز ہو کر اس کے معصوم چہرے پر اپنی داڑھی یوں پھیلا دی جیسے کسی نو بیاہتا جوڑے کی خلوت کے باہر "برائے مہربانی مخل نہ ہوں" کا بورڈ آویزاں کر دیا جائے۔

دوپہر میں جیک اور سلاآسٹ بازار کا ایک چکر لگا کے آئے تو ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ جیک نے کہا "برادر ـــ ہم نے بازار میں شیشوں کے کام والی ایک واسکٹ دیکھی کیا غضب کی چیز تھی، واہ! میں اسے سلاآسٹ کے لئے خریدنا چاہتا تھا لیکن قیمت اتنی زیادہ تھی کہ اپنے تو چھکے چھوٹ گئے!

سلاآسٹ نے طنز سے کہا "قیمت زیادہ تھی تو کیا ہوا! تم نے دیکھا نہیں جیک وہاں کتنے لوگ اپنی دریادلی دکھلانے کے لئے میری آنکھ کے اشارے کے منتظر تھے"

جیک نے شوخی سے کہا ـــ "جان یہ ساری کرامت تمہارے حسن عالمتاب اور میری ریش دراز کی ہے، لوگ تمہاری محرومی کو میری داڑھی کے فٹے سے ناپتے ہیں"

سلاآسٹ نے کہا ـــ "مذاق نہیں جیک تم نے محسوس نہیں کیا مگر وہ مونچھوں اور زہریلی آنکھوں والا وہ آدمی مجھے منقش ٹوپی خرید کر دینے کو کس قدر ضد کر رہا تھا اور وہ جوانِ رعنا جو شاید اپنی خوبصورتی پر پھولا ہوا تھا چینی ریستوراں میں ہمیں اپنے ساتھ کھانا کھلانے پر کس قدر مصر تھا اور وہ نیلی موٹر والا جو اپنے آپ کو کسی بینک کا مینجر بتاتا تھا، ہمیں شہر کی سیر کرانے پر کس قدر آمادہ تھا؟ بے چارے لوگ! مجھے تو ان کے پاس کھڑے ہونے سے وحشت ہو رہی تھی۔ کتنی بُو تھی ان کے بدن میں ـــ ریچھ کی بُو!"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر جیک نے کہا ـــ "برادر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم آج

شام یہاں سے چلے جائیں گے!

"کہاں ——؟" میں نے پوچھا۔

جیک نے سفید عمامے کو اپنے سر پر کستے ہوئے کہا —"بس ہم شام کی گاڑی سے لاہور جائیں گے اور وہاں سے سرحد پار کر کے دہلی اور پھر آگرہ —— آج کیا تاریخ ہے؟" اس نے پوچھا۔

سلاسٹ نے کہا —"دسمبر کی چار تاریخ ہے آج!"

ہاں جیک بولا —— "ہم لوگ کرسمس سے پہلے آگرہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ میں نے سلاسٹ کو تاج محل دکھانے کا وعدہ کیا ہے!"

سلاسٹ مسکرا دی۔ اس نے کہا —— "جیک ہم لوگ کرسمس کی رات تاج محل میں منائیں گے، ٹھیک ہے نا؟"

جیک نے سلاسٹ کے بالوں کو پیار سے چھوا ——"یہ میرا وعدہ ہے جان! کرسمس ہمارے ملاپ کی یادگار بھی تو ہے —— یاد ہے ہم نے سال بھر پہلے اسی موقع پر تو ایک دوسرے کو قبول کیا تھا!"

میں نے چونک کر پوچھا —"اچھا تو کیا تم دونوں کی شادی گذشتہ کرسمس کی رات ہوئی تھی؟"

"کیا ——؟" جیک نے مجھے تمسخر کے انداز میں دیکھا "شادی؟ ہماری شادی تو نہیں ہوئی۔ اس بیکار اور فرسودہ رسم میں کیا رکھا ہے برادر۔ کیا نخوت زدہ پادری اور گرجا کی سڑی بسی تقریب کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ کوئی مرد کسی عورت کو اپنا کہہ سکے؟ یہ تو صرف ان دونوں کا ذاتی فعل ہے۔ اس میں غیروں کی رضامندی ذرہ برابر اہمیت نہیں رکھتی۔ میرے

خیال میں برادر، ہم جو کچھ بھی کریں اس بارے میں سب سے پہلے خود ہمیں مطمئن ہونا چاہئے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ٹھیک ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش بھی نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر ہمارے فعل سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں تو پھر کسی لام خاں کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ کیوں سلاسٹ؟" اس نے محبت سے سلاسٹ کو دیکھا۔ سلاسٹ مسکرادی اور پھر اس کی داڑھی میں منہ ڈال کے جیسے اپنے ہونٹوں سے کچھ ٹٹولنے لگی۔

جیک اور سلاسٹ کے جانے کے تقریباً ایک مہینے کے بعد مجھے ڈاک سے ایک تصویر ملی جس میں دونوں تاج محل کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ جیک کے سر پر بڑی سفید عمامہ بندھا ہوا تھا اور اس کی داڑھی ہوا کے جھونکے سے جاپانی عورتوں کے پنکھے کی صورت نیم دائرے میں پھیل گئی تھی۔ اس نے سلاسٹ کو اپنی باہوں میں سمیٹ رکھا تھا جو اس کے سینے سے لگی ہوئی اتنی عقیدت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی گویا انجیل کا درس پڑھ رہی ہو۔

چہروں کے پہاڑ

سنو جب پہاڑ کی ڈھلوانوں پر شام کا سرمئی جنگل اُگ آتا ہے تو میں یہ کھڑکی بند کر دیتا ہوں اس لئے کہ پھر مجھے وہ چہرہ دکھائی نہیں دیتا جو چٹانوں اور نوکیلے پتھروں کی قدرتی ترتیب سے اس طرح خود بخود وجود میں آگیا ہے جیسے کہ اُسے دیوتاؤں کے ہاتھوں نے تراشا ہو۔ سچ پوچھو تو میں جب بھی اس چہرے کو دیکھتا ہوں ایسا لگتا ہے کہ جیسے پہاڑ کی رُوح بلندیوں سے نشیب کو دیکھ رہی ہو۔ اور صاحب کیا تمکنت ہے، کیسا بارُعب چہرہ ہے، پُرغرور پیشانی، ستواں ناک اور خم در خم داڑھی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ آدمی کی شکل ہے کہ کسی آسمانی دیوتا کی شبیہہ؟ میں اس چہرے کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں، تم نے سُنا خدا بخش یہ پہاڑ مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے!

شاہینہ نے کہا ــــ "پتہ نہیں آپ خدا بخش کو دیکھ کر پہاڑ کا پہاڑہ کیوں پڑھنے لگتے ہیں، پہاڑ، پہاڑ اور پہاڑ ــــ آخر اس کے علاوہ بھی تو کچھ باتیں ہیں مجھے سخت اُلجھن ہوتی ہے۔ آپ اتنے سنگدل تو پہلے کبھی نہ تھے، آپ کو پتہ نہیں، اس کی بیوی چلی گئی ہے!"

"چلی گئی ہے، کہاں چلی گئی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

خُدا بخش نے نگاہیں جھکا لیں اور دھیرے سے کہا "بس جناب عورتوں کا کیا ہے، وہ

تو صحرا کی اونٹنیاں ہیں جس کے ہاتھ میں ان کی نکیل آگئی اس کے پیچھے چل پڑیں۔ مجھے یقین ہے کہ بی بی خود سے نہیں گئی بلکہ اسے ورغلایا گیا ہے، ساری شرارت خانساماں کی ہے، مجھے پتہ ہے۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، پھر بولا "خیر وہ دونوں جائیں گے کہاں۔ پہاڑ سے میرے قبیلے کے لوگ آنے والے ہیں وہ انہیں بہر صورت ڈھونڈ نکالیں گے!" اس کے پتھریلے چہرے پر اداسی کے گلیشیر منجمد تھے اور پیشانی کی سطح مرتفع پر پریشانی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔

شاہینہ نے معصوم لہجے میں کہا۔ "ہمیں معلوم ہے تم کس قدر پریشان ہو، بی بی تو خیر تمہاری بیوی ہے۔ اس کی جدائی تمہارے لئے جتنی بھی تکلیف دہ ہو کم ہے۔ ہم لوگ خود اس کے اچانک غائب ہونے سے بے حد پریشان ہیں، یقین کرو میں جب بھی باورچی خانے کی طرف جاتی ہوں۔ مجھے گنجی بی بی کا خیال آنے لگتا ہے اور پھر مجھے اس مردود خانساماں پر اس قدر طیش آتا ہے کہ بس۔ بی بی ہمیں بہت عزیز ہے، تم اطمینان رکھو صاحب اسے برآمد کرانے میں یقیناً تمہاری پوری مدد کریں گے!"

خدابخش نے کہا۔ "آپ جانتی ہیں بی بی کو میں کتنا چاہتا ہوں، آپ کو پتہ نہیں میں روزانہ اپنے ہاتھوں سے اس کا منہ دھوتا تھا، میں کہتا تھا بی بی تجھے ———!"

شاہینہ خدابخش کے رومانی آبشار والے موڈ سے بوکھلا کے کشیدہ کاری کی طرف متوجہ ہو گئی اور میں نے ہڑبڑا کے کہا ——— "اوہ ہاں خدابخش تم بالکل فکر نہ کرو، وہ تم سے جلد آملے گی ..... تمہیں اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

خدابخش نظروں کے سامنے سے ہٹا تو شاہینہ نے اسے شاندار لفظوں میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے محبت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں!"

"محبت کرنے والے ــــ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے بیویوں سے محبت کرنے والے ـــــ!" شاہینہ نے فوراً تصحیح کی۔

وہ بولی ـــــ "واقعی یہ خدا بخش تو مرا جا رہا ہے اس کے فراق میں۔ دیکھتے نہیں۔ کیا صورت نکل آئی ہے بیچارے کی! اور وہ کمبخت کیسی عورت.....؟"

میں نے کہا۔ "ویسے میری رائے پوچھو تو مجھے اس کمینی عورت سے دلی ہمدردی ہے، جو عورت ایسے ٹوٹ کے پیار کرنے والے شوہر کی رفاقت سے محروم ہو جائے، اس سے جتنی بھی ہمدردی کی جائے اور اس پر جتنا بھی ترس کھایا جائے کم ہے ـــــ!"

شاہینہ نے کہا ـــــ "آپ کچھ کریں ورنہ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنی جان نہ دے بیٹھے، خاصا جذباتی آدمی ہے!"

اور یہ اندازہ تو مجھے اُسی دن ہو گیا تھا جب اس سے پہلی بار چشمے پر ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں وہ تراوٹ مچھلیوں کے سرکاری فارم کی چوکیداری پر مامور تھا۔ صرف کچھ دیر کی ملاقات دوستانہ ماحول میں، ایک ساتھ دوپہر کا کھانا، بچوں کے ساتھ مختصر سی گپ شپ اور پھر جب میں نے تذکرۃً کہا کہ مجھے بھی اپنے گھر کے لئے ایک چوکیدار کی ضرورت ہے تو وہ فوراً اپنی پکی ملازمت چھوڑ چھاڑ کے میرے ساتھ آنے کے لئے تیار ہو گیا۔

میں نے کہا ـــــ "مگر میاں تم سوچ لو کہیں یہ گھاٹے کا سودا نہ ہو۔"

اس نے اطمینان سے کہا ـــــ "صاحب ہم پہاڑی لوگ تو محبت کے غلام ہوتے ہیں۔ آپ نے محبت کا برتاؤ کیا، دوست بنایا، اب آپ کی خدمت ہمارا فرض ہے۔"

اور اس طرح وہ اپنا فرض ادا کرنے مع اپنی فیملی کے ہمارے یہاں آ پہنچا۔

محبت کرنا موصوف کی پرانی عادت تھی۔

ماضی میں انہوں نے دو محبتیں کی تھیں - ایک گنج بی بی سے جو خیر سے اب محبوبہ سے ان کی بیگم بن چکی تھیں اور دوسری قبیلے کے سردار سے، جس سے دور رہنے کا انہیں بے حد قلق تھا - گنج بی بی سے اپنی ملاقات کا احوال سناتے ہوئے ایک دن کہنے لگے میں نے ایک دن اُسے دیکھا تو وہ چکور پکڑ رہی تھی، وہ جس پیار سے دانہ ڈال رہی تھی اور جتنی سُریلی آواز میں ہانکا لگا رہی تھی - اس نے مجھے چت کر دیا - میں نے سوچا، اس کی محبت یقیناً چکور اور مرد دونوں کے لئے برابر ہو گی - بس جی میں نے اپنے باپ کو اس کے گھر بھیج دیا کہ اسے یہ پیغام پہنچا دے کہ ایک پہاڑی چکور صرف ایک اشارے پر اس کی قید میں آنے کو تیار ہے :

سردار کے ذکر سے خدا بخش کی آنکھوں میں عقیدت اور وفا کی انوکھی چمک اُبھر آتی - اس کا خیال تھا کہ اگر سردار کا وجود نہ ہوتا تو اس کا قبیلہ پہاڑ کی ڈھلوانوں سے برف کے پگھلے ہوئے تودوں کی طرح پھسل کے نیچے آ گرتا - اس کی قوت اور قدرت سے سارا کاروبار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور انصاف کا بول بالا تھا - لوگ اپنے کچے گھروں میں آرام سے رہ رہے تھے اور درختوں پر افراط سے شینے اُگتے تھے جنہیں اُبال کے کھانے سے بدن میں چستی پیدا ہوتی تھی -

سردار کے مردانہ حسن اور ذاتی وجاہت کا خدا بخش نے جس انداز سے ذکر کیا تھا اس سے میرا ذہن پہاڑ پر اُبھرے ہوئے پہرے کی طرف منتقل ہوتا تھا، ویسے تو اس میں مجھے خود خدا بخش کے چہرے کا عکس بھی نظر آتا تھا جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جب سب پہرے ایک جیسے ہوں تو ان میں فرق ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے -

ایک دن سفر کرتے ہوئے پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک گھوڑا سوار نظر آیا - قریب سے

دیکھا تو چٹان کی صورت ہی ایسی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چٹان کے عقب سے ایک دیوقامت گھوڑے کا سر اُبھر رہا ہو۔ اس کی اُٹھی ہوئی دو اگلی ٹانگیں ہوا سے سرگوشیاں کرتی نظر آتی تھیں جن کی حرکت اس شخص کے ہاتھوں میں دبی ہوئی باگوں میں سوئی ہوئی تھی جس کے چوڑے چکلے شانوں پر ایک پُر وقار چہرہ بلند تھا۔

میں نے کہا ــــ "دیکھو خدا بخش کیسا عجیب منظر ہے ان پہاڑوں میں کیسے کیسے چہرے، کیسی کیسی صورتیں منجمد ہیں۔"

خدا بخش نے کہا ــــ "بالکل یوں لگتا ہے جیسے یہ سردار کا مجسمہ ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ سردار سے اچھا شہسوار شاید ہی کوئی ہو جب وہ چھوٹا تھا تب بھی دربار کے موقع پر اس نے سواری کے مقابلے میں کئی بار انگریز صاحب بہادر سے انعام لیا تھا۔ گھوڑوں سے اس کی دلچسپی اب بھی اسی طرح قائم ہے اور آج اس کے گھوڑے بڑی بڑی ریسوں میں دوڑتے ہیں اور میدان مارتے ہیں!"

خدا بخش کو سردار کے ساتھ گزرے ہوئے شکار کے لمحات بھی بہت یاد آتے تھے، سردار کا نشانہ، خدا کی پناہ، وہ بے خود ہو کے کہتا۔ اس کی بندوق کی نال سیدھی ہوتی تو پہاڑی بکرے آپ ہی آپ ٹپاٹپ گرنے لگتے۔ پھر جب شکار ختم ہوتا تو ڈیرے پر دعوتِ عام کا انتظام ہوتا۔ سالم بکرے کا روسٹ، سجّی، بھنا ہوا چکور ــــ اس کی داڑھی کی لہلہاتی ہوئی فصل پر لعاب کے چھینٹے پڑنے لگتے۔

سردار بہت پڑھا لکھا تھا اور یہاں جو کچھ اس کی عقل میں کمی رہ گئی تھی وہ اس نے ولایت جا کے پوری کی تھی، اسی لئے وہ اپنے علاقے کا سب سے عقل مند اور سب سے معتبر آدمی تھا۔ خدا بخش کہتا تھا کہ سردار کی رہنمائی کے بغیر قبیلے کے معاملات کسی طرح طے نہ ہو

سکتے تھے، کوئی فرد ایک قدم نہ چل سکتا جیسے سب اندھے ہوں، سردار سب کے ہاتھوں کی لاٹھی تھا، ڈیرے کی ساری رونقیں اس کے دم سے تھیں۔ خدا بخش نے کہا۔ وہ تو ہمارا باپ ہے اور محافظ بھی۔ وہ اپنی طاقت کے بل پر ہمیں زندہ رہنے کا حق دیتا ہے اور اس کے عوض وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، صرف وفا، دوستی، محبت اور اطاعت!

اس نے کہا۔ "میں آپ کو اپنی بات بتاؤں، جب میری گنج بی بی سے منگنی ہو گئی اور ہماری شادی کی تاریخ ٹھہر گئی تو ایک دن بی بی کو گھر سے غائب پایا گیا۔ وہ بھیڑیں چرانے چشمے تک گئی تھی لیکن بھیڑیں شام کو اکیلی واپس آئیں۔ رات میں سردار نے میرے اور گنج بی بی کے باپ کو ڈیرے پر بلایا۔ گنج بی بی اس کے پاس تھی۔ اس نے بی بی کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو مجھے معلوم ہے کہ یہ لڑکی کسی اور کی امانت ہے چھوٹا سردار اسے لے آیا تھا لیکن یہ چند گھنٹوں سے زیادہ اس کے پاس نہیں رہی، اب اسے لے جاؤ اور اس کا بیاہ کرو۔ چھوٹا سردار جذباتی ضرور ہے لیکن اس کی مجال نہیں کہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے جو کسی اور کی ہے!"

"ہاں ــــ" خدا بخش کی آنکھیں ممنونیت کے احساس سے مند سی گئیں، ایسا انصاف کون کر سکتا ہے؟

میں نے کہا ــــ "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سردار تمہارا بڑا خیال کرتا ہے۔ یقیناً وہ تمہاری شادی پر بہت خوش ہوا ہوگا!"

"کیوں نہیں" ــــ خدا بخش نے کہا ــــ اس نے شادی میں میری پوری مدد کی، خرچ بھی دیا اور شہر میں نوکری بھی دلوائی لیکن دراصل یہ سب ان خدمات کا صلہ ہے جو ہمارے بزرگوں نے سردار کے بزرگوں کے لئے انجام دی ہیں۔ ہمارے بڑوں نے سردار کے لئے خون دیا ہے۔ میرے دادا کے چھوٹے بھائی نے تو سردار کے نشانے کی لاج رکھنے کے لئے خود

اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا!"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"پرانی بات ہے، خدا بخش بولا۔ ایک بار انگریز کے سامنے ہمارے سردار کے دادا، جو ہمارے سردار ہی کی طرح نشانے کے پکے تھے۔ نشانہ بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے جو ایک مرتبہ بندوق اٹھائی تو سامنے کوئی جانور نہیں تھا، وہ ابھی نشانہ لینے کے لئے کسی مناسب ہدف کی تلاش میں تھے کہ میرے دادا کے چھوٹے بھائی نے کہا۔ میرے آقا میرے سردار، میں بھاگتا ہوں، آپ فائر کریں اور پھر اس طرح سردار کے دادا دوڑتی ہوئی چیزوں کا نشانہ لینے میں بھی انتہائی چابکدست ثابت ہوتے!"

"ارے ——— میں نے حیرت سے کہا ——— تو گویا تمہارے سردار کے دادا نے فائر کر کے تمہارے دادا کے بھائی کو سچ مچ ہلاک کر دیا؟"

"نہیں تو ——— خدا بخش نے کہا ——— وہ سردار کی آن پر قربان ہو گئے۔ یہ تو ہمارے لئے فخر کی بات ہے!"

پہاڑ سے محبت میں، میں اور خدا بخش برابر کے شریک تھے، پہاڑ کے نزدیک جا کے اس کا سر اونچا ہو جاتا تھا اور اس کی یونانیوں جیسی سیاہ گھنیری داڑھی میں آلوچوں کی خوشبوئیں کروٹیں لینے لگتیں۔ وہ میری پہاڑ دوستی کو بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا۔ "ہم پہاڑی لوگ تو خیر پہاڑ سے دور رہ ہی نہیں سکتے، ہماری ساری طاقت ان میں ہے لیکن آخر آپ کو پہاڑ اتنے کیوں پسند ہیں؟"

میں نے کہا ——— "پہاڑوں کی خاموش بلندیاں مجھے اپنی جانب بلاتی ہیں، وہ مجھے اس لئے بھی پسند ہیں کہ ان کا وجود عالمی سچائیوں کی طرح اٹل ہے اور ان کی چھاتیوں میں قدرت کے

پُراسرار وسیلوں کا دُودھ نذر مانتا ہے!

ایک دن آتے ہوئے میں نے مور کے پروں سے زیادہ رنگ برنگے پہاڑ دیکھے، ہرے پیلے، کاسنی اور ایسے لال پہاڑ جو لگتا تھا کہ گلال سے بنے ہوں۔

میں نے خدا بخش سے کہا۔ "سچ بتاؤ کیا یہ پہاڑ قریب سے بھی اتنے ہی خوبصورت نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی دلفریب اور عظیم؟"

خدا بخش نے مُڑ کے پہاڑ کے اُبھرے ہوئے کوہان کی طرف دیکھا اور مسکرا کے کہنے لگا۔

"جناب پہاڑ تو پہاڑ ہے، دُور سے بھی اور نزدیک سے بھی۔ یہ دُنیا ایسی کہاں ہے جو بدلتی نہیں"۔

میں نے کہا — "بات یہ ہے کہ کبھی میں ان پہاڑوں کے پیچھے جھانکنا چاہتا ہوں، آخر ان کے پیچھے کیا ہے؟"

خدا بخش نے کہا — "ایک اور پہاڑ اور اس کے پیچھے پھر ایک پہاڑ — آپ کو پتہ نہیں پہاڑ تو وادیوں کے دُولہا ہیں۔ دُولہا نجانے کب سے اپنی سہاگنوں کی سیج کے پاس کھڑے ان کے جاگنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔

شاہینہ نے کشیدہ کاری کے فریم سے سر اٹھا کر کہا — "خدا بخش کہہ رہا تھا کہ اس کے رشتے دار کہتے ہیں کہ اگر بی بی مل گئی تو تمہیں اس کو قتل کرنا ہوگا، یہ تمہاری غیرت کا امتحان ہے!"

"پھر — میں نے تجسس سے پوچھا — کیا وہ اپنی کلہاڑی تیز کر رہا ہے؟"

"ہاں — لیکن وہ کہتا ہے کہ جن ہاتھوں سے اس نے بی بی کے لئے پھول چنے ہیں، انہی ہاتھوں سے اُسے قتل کرنا پڑا تو پھر وہ خود بھی ——!"

میں نے کھڑکی کھولی تو سامنے ہی پہاڑ کی چوٹی پر پتھریلا مجسمہ دیوتاؤں کی سنجیدگی سے

وادی میں جھانکتا نظر آیا۔

جس شام گنج بی بی پولیس کی نگرانی میں گھر لوٹی، خدا بخش کے یہاں سخت ہنگامہ برپا تھا۔ ایک طرف خدا بخش کے چہرے پر اضطراب کی مکڑیاں رینگ رہی تھیں اور دوسری طرف قبیلے والوں کی سرگوشیوں کے سانپ پھنکار رہے تھے اور زبان کی تیغوں اور نگاہوں کے تیروں کو تیز کیا جا رہا تھا۔

پولیس نے میاں بیوی کو ملوانے سے پہلے بیانات کا ایک طویل سلسلہ تکمیل تک پہنچایا۔ خانساماں حراست میں تھا۔ میاں بیوی کے ملنے کا منظر عجیب تھا۔ جب وہ دونوں آمنے سامنے ہوئے تو ان کی آنکھوں سے چھما چھم آنسوؤں کی برسات ہونے لگی۔ پھر دیر تک دروازے کے پیچھے سے سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ باہر آ کے خدا بخش نے سب سے پہلے تو صحن میں رکھی ہوئی کلہاڑی کو زور سے لکڑیوں کے ڈھیر میں پھینکا اور پھر بلند آواز میں کہنے لگا۔

"مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس میں بی بی کا کوئی قصور نہیں تھا، اُسے تو چائے میں تعویذ پلایا گیا تھا، اصل میں یہ سب خانساماں کی بدمعاشی تھی!"

گنج بی بی شاہینہ کے قدموں پر گر گئی ——— "بس بیگم جی بڑی غلطی ہو گئی، خانساماں نے جادو کر دیا تھا ورنہ میں بھلا اس بڈھے کھوسٹ کی باتوں میں آنے والی تھی؟"

شاہینہ نے کہا ——— "چلو ٹھیک ہے تم لوٹ آئیں تو خدا بخش کی جان بچ گئی ورنہ وہ تو خود ہی مر کھپ جاتا!"

میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، خدا بخش میرے پاس آیا اور رازداری سے کہنے لگا۔

"صاحب جی پولیس نے خانساماں کو پکڑ رکھا ہے کہتے ہیں مقدمہ چلے گا مگر آج اس کے گھر والے آئے تھے میرے پاس، کہہ رہے تھے سمجھوتہ کر لو سمجھوتہ ——— میں کہتا ہوں کس

بنُیاد پر کروں، پھر سوچتا ہوں کہ جھگڑے بازی سے کیا فائدہ ؟ اگر مقدمہ چلا تو اسے سزا ہو جائے گی، مجھے کیا ملے گا ؟ وہ لوگ تو بہت کچھ دینے کو تیار ہیں، کیا خیال ہے معاملہ طے کر لوں، آخر عزت کے پیسے تو سردار نے بھی دیئے تھے۔ جب چھوٹا سردار ..... !"

اسی لمحے میرے ہاتھ کھڑکی کھولنے کے لئے آگے بڑھے مگر شاہینہ نے زور سے کہا ــــ "کھڑکی مت کھولئے گا...... مجھے ڈر لگتا ہے .... رات میں ادھر سے سوّروں کے چلانے کی آوازیں آتی ہیں !"

آدمی دریا

میں کیسے کہوں سائیں!

میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ میرا باپ اور میرے باپ کا باپ سب حکم کے غلام تھے۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں رہن رکھے ہوئے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ سُرخ بادبانی کشتی پہ اندھیرے جنگلوں سے لکڑیاں لانے جاتا تھا تب کبھی میرا باپ اس موضوع پر زبان کھولتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کے بدن کے سیاہ کھنڈر میں بخار کی لُو چلتی ہوتی مگر وہ کشتی کے بادبان ٹھیک کئے جاتا اور پانی میں بھیگے رسّوں کو اپنے بدن کے گرد لپیٹے جاتا۔ ہمیں کنارے تک جلدی پہنچنا ہے بیٹے یہ رئیس کا حکم ہے! اس وقت مجھے پتہ نہیں تھا کہ رئیس کون ہے اور وہ حکم کیسے دیتا ہے؟ میرا خیال تھا کہ وہ آگ کی بنی ہوئی کوئی مخلوق ہے جس کے ہاتھ میں آتشیں گرز تھما ہوگا لیکن جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی، وہ تو ہم سب کی طرح چار ہاتھ پاؤں والا ایک آدمی تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس کا بدن میرے آبا کے بدن کی طرح سیاہ نہیں تھا اور اس کے سر پر بڑی سی ریشمی پگڑی تھی اور ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی، جس کے سُرخ نگینے سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ جب میں پہلی بار اس کے سامنے گیا تو مونچھ کا سنپولیا رینگ کر میرے بالائی ہونٹ تک پہنچ چکا تھا اور بدن میں آتی جوانی کا سُرخ بادبان تنا ہوا تھا۔ رئیس نے مجھے اوپر سے

نیچے تک دلچسپی سے دیکھا اور میرے باپ سے مسکرا کے بولا — "اچھا تو یہ ہے تمہاری جوانی کی غلطی، خوب — تو سنو اب یہ ہماری تحویل میں رہے گا اور ہمارے لئے کام کرے گا، تم اپنی کشتی چلاؤ، یہ ہماری کشتی چلائے گا!"

میرا باپ تو اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مجھے کپڑوں کی گٹھڑی تھما کے فوراً ہی رئیس کی خدمت میں حاضری کا حکم دیا۔ "مگر، میں نے پوچھا، میں تو پانی کا پرندہ ہوں، خشکی پہ کیسے گزر ہوگی؟ کشتی سے بچھڑنا مجھے پسند نہیں!"

میرے باپ نے کہا — "سنو، ہماری کوئی مرضی نہیں ہے دراصل یہ رئیس کے دیئے ہوئے پر ہیں جن سے تم اڑتے ہو، اب چونکہ اس نے تمہیں پسند کیا ہے اس لئے تمہیں اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، مجھے یاد ہے کہ بڑے رئیس کی بھی یہی عادت تھی وہ جسے چاہتے اپنی خدمت میں طلب فرماتے اور جسے چاہتے دھتکار دیتے، بیٹے ہم سوال کرنے کے لئے نہیں جواب دینے کے لئے پیدا ہوئے ہیں!"

تو جب میں پسند کیا گیا اور رئیس کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ عقدہ کھلا کہ رئیس کا تو کام ہی پسند کرنا ہے، رئیس تو دریا تھا اور وہ ساری بستی کو سیراب کر رہا تھا۔

حویلی میں آنکھ کو حیران کرنے کے لئے بہت کچھ تھا، کمروں اور کوٹھڑیوں کی بھیڑ بھاڑ منقش چھتیں، روغنی دروازے، تہہ خانے اور اندھیری غلام گردشیں جن میں رئیس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ سے روشنی ہوتی تھی۔ مجھے پانی کا پہریدار مقرر کیا گیا تھا۔ رئیس نے کہا تمہارا کام یہ ہوگا کہ پانی کا دھیان رکھو، کھیتوں کو سوکھنے نہ دو اور ندی کو سرکش مت ہونے دو۔

مجھے پتہ تھا کہ ندی کو قابو میں رکھنا کیوں ضروری تھا۔ وہ جو حضرت سخی شاہ سبزپوش

کا مزار تھا عین دریا کے کنارے تو اس میں رئیسوں کا قبرستان بھی تھا۔ پتہ نہیں سبز پوش کا مزار دریا کے کنارے کیسے پہنچا۔ کہتے ہیں کہ پہلے تو دریا خاصا دور تھا مگر پھر وہ سبز پوش کی قدم بوسی کے لئے تڑپنے لگا۔ سیلاب کے دنوں میں دریا کا اضطراب دیکھنے کے قابل ہوتا بالکل یوں لگتا جیسے وہ مزار کی دیوار پھلانگ کے سبز پوش کی قبر کے کنارے اب پہنچا کہ تب پہنچا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جنہوں نے مل جل کے دریا کے کنارے ایک بند باندھ دیا تھا، مٹی کا اونچا سا بند، گویا دریا کو پابہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔ تو مجھے پتہ تھا کہ سبز پوش کے مزار کو پانی کے حملے سے محفوظ رکھنا ضروری تھا۔ سبز پوش رئیسوں کے جدّ امجد تھے اور ان کے نیک قدم یہاں آئے تھے تو یہ بستی آباد ہوئی تھی۔ تو جناب میں اپنا کام کرتا رہا اور رئیس اپنا، ہر سال جب بیگاری بند سے پرے حضرت سخی شاہ سبز پوش کے ہرے گنبد والے مزار پر عرس کا ہنگامہ برپا ہوتا، بستی سے چراغوں کی برات گزرتی اور سبز پوش کے مزار پر عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا، بیلیں بگتیں اور ہاؤ ہو کا شور مچتا تب رئیس کی سواری آتی اور وہ سینکڑوں لوگوں کے مجمع میں سبز پوش کے مزار اقدس پر سنہرے تاروں سے کڑھی ہوئی سبز مخملیں چادر چڑھاتے اور بڑے علم کا پھریرا بدلتے۔ رئیس کی پگڑی کا شملہ دور سے جھلملاتا رہتا اور لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کے اسے دعائیں دیتے۔ رئیس اپنے بزرگوں کے نام روشن کر رہا تھا، وہ سارے بزرگ اور رئیس ابن رئیس جو سبز پوش کے احاطے میں مدفون تھے۔ رئیس بڑی خوبصورتی سے اپنا کردار نبھا رہا تھا بیشک دریاؤں سے نہریں نکلتی ہیں اور زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ان سے تو دریاؤں کی نسل آگے بڑھتی ہے۔

حویلی میں دیواریں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں، ایک دیوار کے پیچھے دوسری

دیوار اور اس کے عقب میں ایک اور دیوار! اور رئیس نے کہا تھا، دیواروں کا احترام تم پر فرض ہے اور جب تک تمہیں اس کا حکم نہ دیا جائے انہیں کبھی پھلانگنے کی کوشش نہ کرنا! سو میں نے ہمیشہ دیواروں کا احترام کیا۔ دیواریں اونچی تھیں۔ کبھی کبھی دروازے بھی اندھے ملتے اور روشنیاں مدھم۔ ایسے میں غلام گردشوں میں سناٹا یہی اعلان کرتا پھرتا کہ کوئی آگے نہ جائے رئیس محوِ خواب ہے۔ ایک بار جب میں حاضر تھا، رئیس نے کہا، میں تو جاگتے میں بھی خواب دیکھتا ہوں، مجھے دھیمی روشنیاں پسند ہیں اور موم بتیاں! وہ کہتا تھا، موم کا بدن پگھلتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے، موم کا اُجلا بدن! موم بتیوں کے مدھم اُجلے میں اس کی خوابگاہ میں لگی ہوئی تصویریں بڑی پُراسرار لگتیں اور تصویریں بھی ایسی کہ آدمی خود تصویر بن جائے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں دُور ہی دُور سے موم کے اُجلے بدن کو اپنی آنکھوں سے کتر رہا تھا کہ رئیس نے عین موقع پر پکڑ لیا، بولا، تمہیں اچھی لگی یہ تصویریں، یہ تصویریں نہیں عورتیں ہیں عورتیں، ذرا غور سے دیکھو! میں شرمایا تو وہ ہنس کے بولا۔ ابھی تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا، جا اپنا کام کر!

تو میں اپنا کام کرتا رہا اور دریا بہتا رہا۔ بند کے پیچھے ایک خشک نہر تھی جس کے سرے پر آہنی دروازے تھے اگر بڑے بند کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو ان کے ذریعے پانی کا رُخ نہر کی طرف موڑا جا سکتا تھا اور یہ رئیسوں کے قبرستان کو محفوظ رکھنے کی ایک شکل تھی۔

ایک دن میں رئیس کی خدمت میں گیا تو دروازے اندھے تھے اور دیواریں چُپ۔ میں الٹے قدموں واپس ہونے کو تھا کہ غلام گردش میں ایک تصویر ٹنگی نظر آئی۔ وہاں اچھا خاصا اندھیرا تھا لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کہا، واہ رے رئیس کا شوق، اب

تو غلام گردشوں میں بھی تصویریں سجنے لگی ہیں۔ ویسے خوب تصویر تھی۔ میں اسے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا کہ وہ ہنس پڑی، بولی ــــ "کیسے آدمی ہو تم عورت اور تصویر میں تمیز نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا ــــ "کمال ہے تم اگر بول نہ پڑتیں تو میں تمہیں تصویر ہی سمجھتا، دراصل میں نے پہلے کبھی اتنے قریب سے کوئی تصویر دیکھی ہے نہ عورت!"

وہ ہنس کے بولی ــــ "کچھ یقین نہیں آتا کہ رئیس کا خاص ملازم اور ــــ!"

میں نے کہا ــــ "میں تو بس ملازم ہوں، تصویروں کا شوق تو رئیس کو ہے!"

وہ بولی ــــ "اچھا تو اب دیکھ لو، تاکہ تمہیں پتہ چلے کہ دریا سے باہر بھی کچھ چیزیں دیکھنے کی ہیں!"

میں نے پوچھا ــــ "تم تو ایسا کہہ رہی ہو جیسے مجھے جانتی ہو؟"

اس نے جواب دیا ــــ میں تمہیں جاننا چاہتی ہوں!

اور مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ مجھے کیوں جاننا چاہتی تھی۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا ــــ "تم دریا کا بہت ذکر کرتے ہو، بتاؤ تمہیں دریا کیوں پسند ہے؟"

میں نے کہا ــــ "اس لئے کہ وہ اپنی مرضی کا مختار ہوتا ہے، آزاد اور سدا کا سیلانی!"

"بس؟" وہ بولی۔

میں نے کہا ــــ "بس اور کیا!"

اس نے کہا ــــ "دریا مجھے بھی پسند ہے مگر اس لئے کہ اس میں طغیانی ہوتی ہے، تند و تیز اور ہلاکت خیز۔ اور تم بھی دریا ہو!"

میں ہنس پڑا — "میں اور دریا؟ کیسی باتیں کرتی ہو، دریا تو رئیس ہے، طاقتور اور سخی!

ایک دن جو میں بند کی طرف گیا تو دیکھا کہ دریا کا اژدہا پھنکاریں مار رہا ہے۔ میں نے آکے رئیس کو بتایا تو اس نے غضب ناک ہو کے کہا — "اسے ہر صورت میں قابو میں رکھو اور اگر خطرے کی بات ہو تو سوکھی نہر کھول دینا"!

وہ مجھے ملی تو کہنے لگی — "دریا میں طغیانی آگئی ہے۔ اف کس قدر اچھا منظر ہوگا جب دریا اپنی کھردری زبان سے زمین کو چاٹتا ہے تو —!"

میں نے کہا — "تم اگر طغیانی دیکھنا چاہتی ہو تو میرے ساتھ چلو —!"

اس کی آنکھیں چمک کے اچانک بجھ گئیں — "کاش میں تمہارے ساتھ جا سکتی کاش —!"

میں نے پوچھا — "کیوں اس میں کیا حرج ہے؟"

اس نے کہا، "تمہیں رئیس نے حکم دیا ہے کہ دریا کو قابو میں رکھو اور مجھ سے کہا ہے کہ اس کے پاس نہ جانا، ہم دونوں اس کے ملازم ہیں"!

میں نے کہا — "اگر تم کہو تو میں رئیس سے اجازت لے لوں، وہ میرے اوپر بہت مہربان ہے"!

وہ اداسی سے مسکرائی، بولی — "وہ میرے اوپر بھی بہت مہربان ہے لیکن میں اس کی مہربانیوں کو بپھرتے دریا میں غرق کر دینا چاہتی ہوں، تمہیں کیا پتہ میں ان سب چیزوں سے کس قدر اکتا گئی ہوں، اندھے دروازے، سنہری روشنیاں اور آنکھوں کے حریص بھونرے!

میں نے پوچھا ــــ "اس کا مطلب؟"

اور وہ سسکیاں بھرتی میرے سینے سے آ لگی۔

میں نے کہا، "سنو ادھر دریا میں طغیانی ہے اور ادھر میرے دل میں سیلاب آیا ہوا ہے، میں تمہاری خاطر ضرور رئیس کے پاس جاؤں گا، وہ میری بات مان لے گا، میں نے اس کی بہت خدمت کی ہے اور اس کے پاس عورتوں کی کیا کمی ہے!"

اور واقعی رئیس میرے اوپر بہت مہربان تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ مسکرایا پھر جھولے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلتا ہوا بولا ــــ "تم ہمیں پسند ہو اس لئے کہ تم فرض شناس ہو اور بہادر، ہم تمہاری خواہش ٹالنا نہیں چاہتے مگر ــــ!"

"مگر ــــ؟" میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

رئیس نے میرے بازو تھپتھپائے ــــ "ہم تمہیں اپنا بھائی سمجھتے ہیں، بھلا ہم یہ کیسے گوارا کریں کہ تم جھوٹے برتنوں میں ــــ سوچو وہ کتنے عرصے سے ہمارے ــــ!"

میں نے آنکھیں جھکا کے کہا ــــ "مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں!"

رئیس نے کہا ــــ "سوچ لو ہم اپنے ادنیٰ ملازموں کو بھی باسی روٹی دینے کے حق میں نہیں اور تم تو ہمیں بہت عزیز ہو!"

اسی وقت میں نے اپنے اندر بھرتی موجوں کی پھنکار سنی اور بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا، "مجھے پتہ ہے وہ باسی روٹی نہیں ہے، وہ باسی روٹی نہیں ہے، مجھے پتہ ہے آپ کے کمرے میں عورتیں نہیں، سب تصویریں ہوتی ہیں، مگر اب

وہ تصویرِ خورت بننا چاہتی ہے ۔۔۔!"

رئیس کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا اور اس کا دریا کی طرح چنگھاڑتا بدن ایک دم سے ڈھے گیا، ایک لمحے کے لئے وہ مجھے سوکھی نہر کی طرح نظر آیا۔ پھر اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور وہ آنکھوں سے چنگاریاں برسا کے بولا ۔۔۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیرے منہ میں سانپ ہے!" یہ کہہ کر اس نے آواز دی اور محافظ اندر داخل ہوئے ۔

اور وہ بھی بڑی طوفانی شام تھی ۔ غصیلا دریا پشتے میں اپنے دانت گاڑ چکا تھا اور اس کی سرکش لہریں مٹی سے چھلنی تراش رہی تھیں ۔ دریا کے بڑھتے ہوئے شور میں، میں نے دیکھا کہ سبز پوشوں کے مزار کے احاطے والا پشتہ دریا کے جبڑے میں کانپ رہا تھا اور پانی کا رساؤ بہت شدید تھا ۔ اس وقت میں اگر سوکھی نہر کے دروازے کھول دیتا تو پشتے پر پانی کا زور یقیناً ٹوٹ جاتا، ایک بار میں نے سوچا بھی کہ لپک کے جاؤں لیکن اُسی لمحے میری نگاہ رئیسوں کے قبرستان کی طرف گئی تو یوں لگا کہ جیسے وہ بھی کوئی کھیت ہو ۔ میں نے سوچا، سچ تو ہے اس میں کیسے کیسے دریا صفت لوگوں کی کاشت ہوئی ہے اور قدرت نے یہاں کیسی کیسی بے بہا شخصیتیں بو رکھی ہیں، کیا عجب ہے کہ یہ ہستیاں پھر سے پیدا ہوں ۔ شاید یہ کھیت سیراب ہونے کا منتظر ہے، اور میں کھیتوں کو پیاسا نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ سو میں بیٹھا رہا اور میری نظروں کے سامنے سیلابی پانی پشتے کو توڑتا ہوا رئیسوں کے قبرستان میں جا گھسا اور مستائے کتے کی طرح باری باری تمام قبروں کو سونگھتا پھرا ۔ ان میں ایک تازہ قبر بھی تھی ۔

"جناب عالی!"

میں اپنا سر اوپر اٹھاتا ہوں ۔

وکیل کہتا ہے۔

"جناب عالی! اس شخص کو نیم دیوانگی کی حالت میں، واردات کے ایک دن اس جگہ پایا گیا جہاں بند میں شگاف پڑا تھا۔۔۔!"

میں دیکھتا ہوں، تماشائیوں کا ہجوم ہے جن کے چہروں پر سرور و انبساط کی تحریر ہے۔

وکیل کہتا ہے۔۔۔"اس شخص کے بیان سے واقعات پر سے پردہ اٹھ سکتا تھا لیکن افسوس کہ یہ بول نہیں سکتا کیونکہ اس کی زبان۔۔۔!"

میں اپنا سر ایک بار پھر اوپر اٹھاتا ہوں اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر نظریں جھکا لیتا ہوں۔

پتہ نہیں میں گونگا ہوں یا یہ تمام لوگ بہرے ہیں!

میں کیا کہوں؟

میں کیسے کہوں سائیں؟

❖

ایش ٹرے

پھر اسے یوں لگا جیسے وہ زمین کے کاسنی کچھوے پر سوار آہستہ آہستہ آسمان کی سوکھی ہوئی جھیل کی سمت جا رہا ہو۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے بوجھ سے زمین کانپ رہی ہو اور ڈھلوان پر بکھرے ہوئے رنگ برنگے پتھر خود بخود آگے کی طرف لڑھکتے جا رہے ہوں۔
اس کے لئے یہ کوئی نیا احساس نہیں تھا۔ ٹیکے کے بعد اس کی کیفیت ایسی ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے وجود کے پتھریلے چوکھٹے سے دوڑتا ہوا باہر نکل آتا اور آنکھیں قفس سے آزادی پانے والے سرفرو پرندوں کی طرح فضا کی وسعتوں میں کھو جانا چاہتیں۔ اس کے بغیر اُسے اپنی قوت میں کمی محسوس ہوتی اور وہ خود کو اس کمزور جالے سے مختلف محسوس نہ کرتا جو چھت کے کسی کونے میں لپٹا ہوا اپنے ہونے کے خوف سے تھر تھراتا رہتا ہے۔ امینہ کہتی —— "دیکھو میں نے اسی لئے تو تمہارا ہاتھ پکڑا ہے کہ تمہیں تمہارے وجود کا احساس دلا سکوں، تم وہ نہیں ہو جو تم ہو، تمہیں وہ ہونا چاہیئے جو تم نہیں ہو!"

امینہ بہت عجیب تھی اور یہ بات اس نے اُسی دن محسوس کی تھی جب وہ پہلی بار اس کے سامنے آئی تھی حالانکہ وہ اس دن بھی اپنے آپ میں نہیں تھا۔

بارش میں نہائی ہوئی سرد طوفانی رات بھیگی ہوئی بیمار سڑک اور تیمارداروں کی طرح اس پر جھکے ہوئے چنار کے غم زدہ درخت —— پھر ایک دھماکہ —— اور اس

نے جیپ کو ایک بڑے سے سفید پھاٹک کے سامنے ایک تناور درخت سے ٹکراتے دیکھا۔ یکایک پیشانی کے اُفق پر درد کا سورج چمکا اور پھر گھور اندھیرا ۔۔۔۔۔۔!

لیکن اس کی آنکھیں کب تک بند رہتیں۔ جب روشنی نے اس کی پلکوں پر دستک دی تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی ہلکا ہوا نرم ہاتھ اس کے ماتھے پر ہے اور پھر آواز کی ایک خوش رنگ تتلی اس کے اندھیرے وجود میں دُور تک دوڑتی چلی گئی ۔۔۔۔۔ "میں امینہ ہوں امینہ!"

اور تب اسے ہوش میں آنا بہت اچھا لگا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کے سنگی پہلو میں ایسا چور دروازہ ہے جہاں سے کسی وقت بھی کوئی خوشی اندر داخل ہو سکتی ہے۔ مگر امینہ تو ایسی انوکھی خوشی تھی جس نے دل میں ہمیشہ کے لئے پڑاؤ ڈال دیا۔ ایک دن اس نے امینہ سے کہا۔ "سنو تم ٹھہریں اُونچے سفید دروازوں اور بلبے برآمدوں والے گھر کی بیٹی اور میں ٹھہرا ایک پہاڑی ۔۔۔۔۔ بھلا کون یہ بات پسند کرے گا؟"

امینہ نے کہا ۔۔۔۔ "مجھے کھردرے مرد پسند ہیں جو لوگ قوم کے گڑے کو اپنی شخصیت کا حصہ سمجھنے لگیں مجھے ان سے لگاؤ نہیں!"

"مگر ۔۔۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔۔۔ تمہیں اگر اچھائی کی تلاش ہے تو مجھ میں اچھائیاں بہت کم ہیں ۔۔۔۔ میں صاف بتادوں کہ میں بدل بھی نہیں سکتا!"

امینہ شرارت سے ہنسی ۔۔۔۔ "مجھے افسوس ہوگا اس لئے کہ تھوڑے سے ردّ و بدل سے تم اچھے خاصے کام کے آدمی بن سکتے ہو ۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر یہ جو تمہاری داڑھی ہے نا، لگتی ہے کہ جیسے سیاہ پتھر سے تراشی ہوئی ہے۔ اگر اسے تمہارے چہرے کے فریم سے گھٹا دیا جائے تو لوگ تم سے ڈرنا چھوڑ دیں گے مجھے،

چاہو تو تجربہ کرلو!"

اس نے کہا ——— "تم مجھ سے کیا کیا چھڑاؤ گی لڑکی ——— میں نے پہاڑ کی سختیاں اور دشت کی آزادیاں ورثے میں حاصل کی ہیں ——— تم مجھے نہیں جھیل سکتیں!"

امینہ نے اس کے ہولسٹر سے پستول نکالا اور ہاتھ میں لے کر کہا ——— "یہ مٹھی بھر آگ جو تمہاری قوت ہے میں اس کی قسم کھاتی ہوں ——— میں نے تمہیں ترک کرنے کے لئے منتخب نہیں کیا ——— دیکھنا میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی!"

اس نے کہا ——— "بابا میں کوئی اچھا آدمی نہیں۔ مجھ میں غصہ بہت ہے۔ پہلے تو آزادی کا نشہ کیا کم ہوتا ہے، اس پر ہر طرح کا نشہ خود پہ سوار رکھتا ہوں۔ میں تو تمہیں پوری آنکھ کھول کے دیکھ بھی نہیں سکتا ——— سچ کہوں، مجھ سے تو گھر بلکہ سارے قبیلے میں کوئی خوش نہیں ——— آخر تم کیوں؟"

امینہ نے پستول اس کی کمر میں اڑس دیا اور کہا ——— "میرے اچھے پہاڑی! میں تمہیں انسان بناؤں گی، انسان ——— اور بھئی تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ گولی چلائے بغیر ایک پلی پلائی بھیڑ تمہارے قبضے میں آگئی ہے ——— تم کیسے شکاری ہو؟ کیا چکور کے علاوہ تم نے آج تک کچھ بھی شکار نہیں کیا؟"

اس نے پاس پڑے ہوئے پتھر پہ سگریٹ رگڑ کر بجھا دیا۔ شکار ———؟ شکار تو آگیا لیکن اونچے محراب دار سفید دروازوں کے پیچھے زلزلہ سا آگیا ——— اونچی چمنیوں سے آگ نکلنے لگی۔

امینہ نے کہا ——— "میں اونچے سفید گھر کا فیصلہ ماننے سے انکار کرتی ہوں، میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

اس نے کہا ـــــــ "دیکھو بغاوت کے لئے حوصلہ چاہیئے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ اپنا خون اچھالنا اچھی بات نہیں۔"

امینہ نے اطمینان سے کہا ـــــــ "میں کوئی ایسی بات نہیں سوچتی جو پوری نہ کر سکوں، میں تمہارے ساتھ......"

پھر جب وہ سفید گھر سے دُور سیبوں کے درختوں کی فصیل کے پیچھے پہاڑی ڈاک بنگلے میں آنے والے دنوں کے خواب دیکھ رہے تھے، اچانک فضا میں بندوقوں کے دھماکے گونجے۔ پھر حفاظتی گارڈ کی سیٹیاں ان پر ٹوٹے چھتے سے اُڑی ہوئی شہد کی مکھیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔ آنسو گیس کے بادلوں نے انہیں نیلا لحاف اُڑھا دیا لیکن اسے اپنی بندوق پر ناز تھا۔ اس کی بندوق سے نکلنے والی گولیوں نے ان کے گرد ایسا حفاظتی حصار کھینچ دیا جسے کوئی نہ توڑ سکا۔

امینہ نے کہا ـــــــ "مجھے تمہاری یہی بات پسند ہے کہ تم پہاڑ کی طرح اٹل ہو!"

اس نے کہا ـــــــ "مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ میں اب تک صرف اپنے آپ کو اٹل سمجھتا تھا لیکن پتہ چلا کہ تم بھی کچھ کم نہیں۔"

اس نے ٹھوکر مار کر کچھ پتھر ڈھلوان پر لڑھکائے اور شفق کے سرخ آنچل میں لپٹے ہوئے وسیع و عریض دشت کو اپنی آنکھ کی پتلی میں جذب کرتے ہوئے پھر ایک سگریٹ سلگایا۔

ایک دن امینہ نے کہا ـــــــ "بخدا مجھے ایسے مرد پسند ہیں جو سگریٹ بھی اس انہماک سے پیتے ہیں گویا زندگی کا کوئی راز جان رہے ہیں۔"

اس نے کہا ـــــــ "پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ میں نے زندگی میں کوئی اور کام

نہیں کیا سوائے زندگی کے نت نئے رازوں کو جاننے کے ——— تمباکو نوشی تو زندگی کا سب سے بھیڑ چھپا راز ہے۔ میں تو بڑے بڑے رازوں کو جان گیا ہوں!

امینہ مسکرائی ——— "مجھے معلوم ہے تمہیں سبز بیری یعنی چرس سے خاص شغف ہے اور تم نے اپنے بازو مارفیا کے ٹیکوں کے سپرد کر رکھے ہیں مگر یاد رکھو اب تمہیں اپنے ہاتھ میرے حوالے کرنا ہوں گے!"

پھر خشک پہاڑوں کی اس وادی میں ایک تاروں بھری رات تھی جب انہیں سرخ قالینوں سے سجے ہوئے ایک کمرے میں قرآنی آیات کی ڈوری سے زندگی بھر کے لئے ایک ساتھ باندھ دیا گیا۔

اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور خود سے بولا ——— یخنی کے پکے ہوئے گوشت اور چاول کے بڑے بڑے لقمے نگلتے ہوئے قبیلے کے بزرگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ دلہن کو رخصت کرنے اس کا باپ کیوں نہیں آیا؟ اس کی ماں؟ اس کے بھائی بہن؟ اس نے سوچا ——— سفید گھر والوں کے لئے تو یہ شاید ماتم کی رات تھی۔

لیکن امینہ ———؟ اس نے خط لکھا "پیارے پپا میں آپ سے شرمندہ ہوں، اس لئے نہیں کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے ہرگز نہیں ——— میں اپنے آپ کو حق پر سمجھتی ہوں ——— آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنا اچھا برا سمجھنے کی تربیت دی، مجھے علم دیا، جرأت دی ——— البتہ مجھے رنج ہے ——— بہت ہی بے حد رنج ہے کہ قدرت نے مجھے آپ کی بیٹی بنایا ——— کیونکہ آپ باپ ہونے کے ساتھ ساتھ چناور کی طرح بہت بلند مرتبے کے آدمی ہیں اور میرا ذاتی خیال ہے کہ بلند مرتبے کے سفید گھروں میں رہنے والے لوگوں کے یہاں بیٹیاں نہیں ہونی چاہئیں، مجھے

بہت افسوس ہے ـــ لیکن پپا ـــ شاید آپ کو یہ سُن کے کچھ سکون ہو کہ میں اور وہ، دونوں شادی کے بندھنوں میں بہت خوش ہیں۔ آپ کو مبارک ہو کہ آپ کی بیٹی، آپ کے سفید محرابوں والے اونچے گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئی ہے! فقط آپ کی بیٹی ـــ اور ہاں مما کو میرا سلام ـــ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لئے روتی ہوں گی لیکن آپ انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتے ہوں گے ـــ خیر میں ان کے آنسوؤں کی نمی اپنے گالوں پر محسوس کر سکتی ہوں ـــ! خدا حافظ!"

اس نے کہا ـــ "لیکن بھلا اس خط کا فائدہ ـــ جب ان سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تو پھر ـــ؟"

ایمنہ نے ٹھنڈی سانس بھری ـــ "میرے پہاڑی! تم بچّی کھاد اور شکار کرو ـــ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

اس نے ایک پتھر اٹھا کے زور سے دُور پھینکا جو پتھروں کے ایک ڈھیر پر جا گرا۔ دراصل اس کی سمجھ میں تو کئی اور باتیں بھی نہیں آتی تھیں مثلاً یہی کہ ایمنہ کو اس کا چرس پینا کیوں بُرا لگتا تھا اور وہ اسے ٹیکوں سے کیوں روکتی تھی۔ ایک دن اس نے بگڑ کے کہا ـــ "دیکھو بھئی مجھے ان معاملات میں تمہارا دخل دینا بالکل پسند نہیں۔ میں ٹیکے کو یوں نہیں چھوڑ سکتا کہ اس سے میرے اندر چھپا ہوا "میں" باہر آ جاتا ہے جو تیندوے کی شکل کا ہے اور مجھے اپنی وہ صورت پسند ہے۔"

پھر ایک دن جب وہ تیندوا بنا ہوا گھر میں گھسا تو دیکھا کہ ایمنہ بھولی ہوئی مُرغی کی طرح کٹکٹاتی پھر رہی ہے اور اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی ہیں۔ ایمنہ نے کہا ـــ "میں نے سوچا چونکہ تمہیں ٹیکہ پسند ہے لہٰذا میں بھی.....!"

اس نے ایمنہ کا بازو دیکھا۔ وہاں سوئی کے ڈنک کا سُرخ نشان تھا۔ یکایک اس نے غصّے سے بل کھاتے ہوئے درندے کو اپنے مساموں سے باہر نکلتے دیکھا۔ کمرہ غراہٹوں سے بھر گیا۔

اور پھر جب موسم قدرے بہتر ہوا تو اس نے کہا ——— "تم نے ایسا کیوں کیا ایمنہ؟"

ایمنہ نے ایک نظر اپنے بدن پر نیلاہٹوں کے سانپوں کو رینگتے دیکھا۔ پھر مسکرا کے کہا ——— "میں نے ٹیکہ نہیں لگایا تھا۔ صرف اداکاری کی تھی لیکن مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ تم تیندوے تو ہو مگر صرف تیندوے نہیں ہو۔"

اس نے کہا ——— "میں نے تمہیں بتایا تھا ایمنہ کہ میں غصّے پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو تبدیل بھی نہیں کر سکتا ——— میں نے تمہیں بتا دیا تھا!"

ایمنہ نے کہا ——— "میں ڈرتی تھی کہ تم پہاڑ کے دامن سے پتھر چنتے چنتے آدمی اور پتھر کی پہچان کھو چکے ہو۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہارے نزدیک میری کچھ اہمیت بھی ہے۔"

"اہمیت!" ——— اس نے کہا ——— "میں نے آج تک اس بارے میں نہیں سوچا لیکن ہر شے کی ایک اہمیت ضرور ہوتی ہے۔"

ایمنہ نے مسکرا کے کہا ——— "جیسے ستونوں پر سجے ہوئے پرانے ہتھیاروں کی اور دیوار پر ہرن کے سر کی یا پھر جیسے اونکس کے بنے ہوئے مجسموں کی۔"

یکایک اس کی انگلیوں میں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اس نے چونک کے دیکھا۔

سگریٹ پورا جل چکا تھا۔ اس نے سگریٹ بجھایا اور اپنے پہلو میں ابھری ہوئی رنگین پتھروں کی ڈھیریوں کو دیکھنے لگا جن کا سلسلہ کاسنی رنگ کے میدان میں دور تک چلا گیا تھا۔ ایک ڈھیر پر نیلے چمکدار پروں والی چڑیا بیٹھی اسے تک رہی تھی۔ نیلاہٹ چڑیا کے پروں سے اتر کر اس کے وجود میں رینگ گئی۔

امینہ نیلے کپڑوں میں ملبوس، سفید گاؤ تکیئے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا، اور اس کے کھلے ہوئے بالوں کو چھو کے بولا ـــــ "لگتا ہے تم نے آسمان اوڑھ رکھا ہو۔ کہیں تم کوئی آسمانی مخلوق تو نہیں؟"

امینہ مسکرائی ـــــ "نیلا رنگ مجھے پسند ہے۔ شاید اس لئے کہ اس میں سمندر اور آسمان کی وسعت جھلکتی ہے!"

اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا ـــــ "لیکن جان یہ نیلاہٹیں ہاتھ آنے والی نہیں۔ یہ دوری کے رنگ ہیں اور میں تمہیں اپنے سے دور نہیں دیکھنا چاہتا!"

"سچ!" ـــــ امینہ نے دور رکھی ایش ٹرے اس کے پاس سرکائی۔ "مجھے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہے ـــــ وہ ہنسی ـــــ میں سمجھتی تھی کہ مرد چاہے کسی روپ میں ہو، اس کے نزدیک عورت کا وجود ایک ایش ٹرے کی طرح ہے جسے وہ اپنی طلب کا سگریٹ بجھانے کے لئے استعمال کرتا ہے ـــــ بس ایک ایش ٹرے!"

ایک دن امینہ نے کہا ـــــ "سنو اگر سفید گھر والے ہمیں معاف کر دیں تو؟"

اس نے غرّا کے کہا ـــــ "مجھے اس کی کوئی خواہش نہیں ہے!"

امینہ بولی ـــــ "نہیں میرے پہاڑی! اتنے اہم فیصلوں میں اس قدر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔"

اس نے کہا ـــــ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ان کے بارے میں اتنی فکر مند کیوں ہو؟ جو لوگ تمہیں بھلا چکے، تمہیں بھی انہیں بھول جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے!"

امینہ نے ایک لفافہ اس کے سامنے ڈال دیا۔ امینہ کے پپا کا خط تھا۔

"بے بی! جو کچھ ہوا ہمیں اس پر سخت افسوس ہے۔ کیا اچھا ہوتا جو تم اس گھر سے ایسے رخصت ہوتیں جیسے بیٹیاں باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہیں لیکن خیر ـــــ یہ بتانا قطعی غیر ضروری ہے کہ تمہاری ممّا تمہیں یاد کر کے بہت روتی ہیں حالانکہ یہ بات مجھے ذرا بھی پسند نہیں ـــــ تم اس گھر سے صرف اپنے فیصلے کی بنیاد پر گئی ہو اور اپنی خوشی سے ـــــ یقین کرو اب میں اس واقعے کو اس طرح ذہن سے نکال چکا ہوں جیسے کہ تمہاری پیدائش کا واقعہ میرے ذہن میں نہیں ہے ـــــ بے بی ہماری دعا ہے کہ تم دونوں خوش رہو ـــــ اس خط کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا چیک منسلک ہے۔ یہ رقم کیوں بھیجی جا رہی ہے میرا خیال ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں ـــــ بیٹیاں ماں باپ کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں جاتیں ـــــ ہمیشہ تمہاری خیریت کا خواہاں ـــــ تمہارا پپا"

اس نے کہا ـــــ "میں اسے لفظوں کی فضول خرچی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا! تم چیک واپس کر دو۔"

امینہ نے کہا ـــــ "کسی مناسب نتیجے پر پہنچنے کے لئے سوچ بچار ایک اچھی عادت ہوتی ہے۔"

اس نے کہا ـــــ "دیکھو میں بہت سنجیدہ ہوں ـــــ میں نہیں چاہتا کہ ان کا کوئی احسان لیا جائے۔ تم وہ چیک مجھے دے دو۔"

امینہ نے کہا ـــــ "نہیں میرے پہاڑی یہ نہیں ہو سکتا۔"

اس نے غصے سے تلملا کر کہا ــــــ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا ایک لاکھ روپے سے ہم بہت امیر ہو جائیں گے؟ اور کیا تم مجھے ایسا گیا گزرا آدمی سمجھتی ہو؟ ــــ میری کانیں ــــ میرے پتھر ــــ میرے پہاڑ ــــ!"

امینہ نے جواب دیا ــــ "نہیں میرے نزدیک روپے کی کوئی اہمیت نہیں مگر ــ"

اس نے چلا کے کہا ــــ "میں جانتا ہوں کہ تم آسانی سے وہ چیک مجھے دینا پسند نہیں کرو گی لیکن میں ہر قیمت پر ــــ"

"ہرگز نہیں" ــــ امینہ نے غصے سے کہا ــــ "یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں چیک نہیں دے سکتی ــ"

تیندرا اس کے اندر غرّا کے اٹھا، اس نے کہا ــــ "سنو مجھے یہ چیک اس لئے قبول نہیں کہ اس کے ذریعے انہوں نے تمہاری محبت خرید لی ہے ــــ وہ محبت جس سے وہ محروم ہو چکے تھے ــــ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم میرے علاوہ ــــ!"

امینہ نے کہا ــــ میری بات تو سنو، میں ــــ"

تیندرے نے باہر کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ دیوار پر سجے ہوئے ہتھیاروں کی طرف لپکا۔ چھرا اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس نے چلا کے کہا ــــ "میں کچھ نہیں سننا چاہتا میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں پاگل آدمی ہوں مجھ سے ہوشیار رہنا۔ لیکن شاید تم مجھے پاگل ہی دیکھنا چاہتی ہو۔ لاؤ چیک میرے حوالے کر دو ــ"

امینہ نے آنکھوں میں آنسو سجاتے ہوئے کہا ــ "ہرگز نہیں، میں بھی بہت ضدی ہوں ــ"

اس نے کہا ــــ "ٹھیک ہے تم میری بات نہ مانو، میں یہ چھرا اپنے ــــ!" اس

نے چھُرا بلند کیا، کوندا لپکا اور جیسے ہی چھُرا نیچے آیا، امینہ دوڑ کے اس سے لپٹ گئی چھُرے نے اس کی پسلیوں میں نقب لگائی۔ امینہ نے اپنے بدن سے اُبلتے خون کو اپنے ہاتھوں بمدم توڑتے دیکھا اور لرزتی آواز میں بولی ـــــ "میں اپنی محبتوں کو فنا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

اسے برقی جھٹکا لگا۔ اس نے امینہ کے پھڑکتے ہوئے بدن کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا ـــــ "اوہ ـــ پچ مچ میں پاگل ہوگیا تھا امینہ میں نے یہ کیا کیا!"

امینہ نے اپنے سرد ہوتے خون آلود ہاتھ سے اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ٹھیک کیا اور کمزور آواز میں کہا ـــــ "تم بہت اچھے ہو ـــــ میں تمہیں چاہتی ہوں شاید تمہارے پاگل پن کی وجہ سے ـــــ لیکن تم مجھے اونکس کا بُت سمجھتے تھے!"

اونکس ـــــ پتھر ـــــ سنگریزہ ـــــ؟ اس نے جھرجھری لی اور اپنے پہلو میں اُبھرے ہوئے رنگین پتھروں کے ڈھیر کو دیکھا۔ امینہ سنگریزوں کے ڈھیر میں سو رہی تھی۔ اُسے لگا جیسے سبز و سُرخ سنگریزوں کا ڈھیر کسی پہاڑی جانور کی طرح چلتا ہوا اس طرف جارہا ہو جہاں دھرتی کی کاسنی دہلیز پہ نیلا آسمان اتر رہا تھا۔ امینہ کو نیلا ہٹیں عزیز تھیں۔

پھر وہ اونٹ کی طرح بلبلا کے رو دیا ـــــ وہ کھردرا، سخت جان اور بلند قامت پہاڑی جس کی داڑھی بھی سیاہ پتھر سے تراشی ہوئی لگتی تھی۔

جب وہ امینہ کی قبر کے پاس سے اٹھا تو اسے اپنے قریب ہی ایک بڑا سا بجو کو رپتھر پڑا نظر آیا۔ اس کی ہتھیلی پر بہت سے سیاہ داغ تھے ـــــ سگریٹوں کے ڈنک کے نشان ـــــ

وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر اٹھا کے دور پھینک دیا۔ پتھر ہوا میں چکراتا ہوا امینہ کی قبر کے سرہانے جا گرا جہاں کوئی کتبہ نصب نہیں تھا۔

❖

ناٹک روزمرّہ

وقت : صبح کا

منظر : درمیانے طبقے کے گھر کی خوابگاہ

کردار : ایک بیزار، بیقرار اور بے چین آدمی یعنی ہیرو لیکن ہیروئن کے بغیر کیونکہ ہیروئن پو پھٹتے ہی تکیئے سے باہر چلی گئی ہے۔ ہیروئن روز ہی کرتی ہے اور ہیرو کو تنہا چھوڑ کے صحن میں اندھیرے کے پھڑپھڑاتے پرندے کو شکار کرنے چلی جاتی ہے۔

الارم بجتا ہے۔

اے بے سُرے طوطے تجھے بھی اسی وقت بیچارے ہیرو کو تنگ کرنا تھا اور رات آنکھ رانی بھلا یہ بھی کوئی جاگنے کا عمل ہے ابھی تو آدھے دھڑ کی نیند پوری نہیں ہوئی، کیا حرج ہے اگر ہیرو ابھی تھوڑی دیر اور ——— وہ کیا کہتے ہیں بستر استراحت نہیں بلکہ بستر محبت کی آغوش میں رہے، نرم و گرم آغوش میں ——— چھوڑو یار ہیرو، باتوں میں وقت ضائع مت کرو، اب سو جاؤ، سو بھی جاؤ کیونکہ آج چھٹی ہے، چھٹی بھی ایسی ویسی نہیں زبردستی کی چھٹی، دفتر کھلا ہو گا تو کھلا رہے اور لوگ بسوں کی لائن میں لگے ہوں گے تو لگے رہیں، اپنی بلا سے!

وہ کروٹ بدل کے تکیئے میں منہ چھپا لیتا ہے۔

اچھا تو اب چھٹی منانی ہے تو پھر چھٹی کی طرح مناؤ، اچھا تو کیا پروگرام ہوگا؟

نمبر ایک: گھر سے کہیں نہیں جانا۔

نمبر دو: ذہن کی کثافتوں کو دور کرنا ہے اور اس چرخے ایسی زندگی، اس اکتا دینے والی زندگی کو سلام، بھلا دہ کیا شعر ہے پن چکی والا، نہر چکی، چکی یا کولھو کا بیل؟ نجانے کیا بلا ہے، تو آج اس کولھو کے بیل پر لعنت، پن چکی پر بھی لعنت! چلتے چلتے پاؤں گھس گئے ہیں۔

وہ گھٹنے موڑ کے اپنے پاؤں چھوتا ہے۔

واقعی گھِسے ہوئے لگتے ہیں، یہ بھی سوچنے کی بات ہے پہلے جب میں چھوٹا تھا تو جوتے کتنی جلدی چھوٹے ہو جاتے تھے پاؤں جو بڑے ہو جاتے تھے لیکن اب ـــــ؟ اب تو سالہا سال سے ایک ہی سائز کے جوتے پہنتا آ رہا ہوں، پاؤں یقیناً اب بھی بڑھتے ہوں گے لیکن اب مستقل گھِستے رہنے کی وجہ سے سائز میں فرق نہیں پڑتا، خیر تو یہ طے ہے کہ آج کہیں جانا نہیں ہے، آج پاؤں بھی گھِسنے سے محفوظ رہیں گے!

وہ اپنے پاؤں لحاف کے اندر پھیلا دیتا ہے۔

نمبر تین: ہیروئن صاحبہ کے ساتھ تکلفات عامہ بالکل برطرف اور تعلقات عامہ پر زور! یعنی آج ہیرو اور ہیروئن کے بیچ میں ظالم سماج کو پھٹکنے نہیں دیا جائے گا اور ہر رقیب رُو سیاہ پر لعنت، سو بار لعنت ـــــــــ

مگر بھائی یہ ہیروئن صبح صبح کدھر چلی جاتی ہیں، افسوس، محبت کی گھڑی کیسی ناپائیدار ہوتی ہے ـــ!

وہ ڈبل بیڈ پر ہاتھ پھیلاتا ہے اور تکیے کو کھینچ کے سینے سے لگا لیتا ہے۔

اچھا تو بستر اب بھی گرم ہے اور تکیئے سے موصوفہ کے بالوں کی خوشبو اب تک جدا نہیں ہوئی، گہری سانس لیتا ہے، ہا ــــــ!

غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آتی ہے۔

او ہو، برخوردار وہ تو غسل فرما رہی ہیں، تو یہ مصیبت ہے، بڑی بی کو نہانے کی اتنی جلدی رہتی ہے تو کل سے کیوں نہ نہانے کے ٹب میں......!

چلئے اب پانی گرنے کی آواز تو بند ہو گئی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہیروئن اشنان سے فارغ ہو چکیں گویا ایک بار پھر ان کی پیدائش عمل میں آئی اور وہ کسی بچی کی طرح معصوم اور پاکیزہ ــــ یہ خوب، بھولی چڑیا ــــ!

باورچی خانے سے برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آتی ہیں۔

اچھا تو گویا وارننگ دی جارہی ہے کہ اٹھو اور مکرکس کے اپنا راستہ ناپو، نہیں صاحب آج یہ زبردستی نہیں چلے گی، بندہ اس وقت تک بستر سے کنارہ کش نہیں ہوگا جب تک کہ پورے بدن کی تھکاوٹ دور نہیں ہو جاتی!

دور سے اس کی بیوی کی آواز آتی ہے: کیا بات ہے آج اٹھنا نہیں ہے؟ کچھ پتہ بھی ہے کیا وقت ہوا ہے؟

وہ کہتا ہے: تم فکر مت کرو، آج میں نہیں جاؤں گا اور دیر تک سونے کا پروگرام ہے بلکہ سنو تم بھی آجاؤ، بستر گرم ہے!

جواب میں کوئی آواز نہیں آتی۔ تھوڑی دیر بعد بچوں کے کمرے سے کھٹ پٹ کی آوازیں ابھرتی ہیں۔ وہ چپ چاپ لیٹا تکیئے سے بدلے نکالتا رہتا ہے۔

سڑک کی طرف سے بس کے رکنے اور ہارن بجنے کی آواز آتی ہے۔ کوریڈور میں

بچّے دوڑتے ہیں اور نرم نرم آوازیں کمرے میں تیرتی ہیں۔

خدا حافظ امّی!

خدا حافظ بچّو! احتیاط سے جانا! اس کی بیوی کی آواز ابھرتی ہے پھر دروازہ کھلنے اور بس چلنے کی آوازیں اور طویل سنّاٹا!

اچھا تو بچے بھی اسکول چلے گئے، گویا دن واقعی شروع ہو گیا ہے!

وہ لحاف سے سر نکالتا ہے، دھوپ کی کرن کھڑکی سے اسے جھانکتی ہے۔

سوری ڈیئر، میں ابھی نہیں اٹھ سکتا، آج تو میرا یوم تجدید محبّت ہے، آج کوئی گڑبڑ نہیں چلے گی!

برابر کی میز پر چائے کے برتنوں کے رکھنے کی آہٹ اور جلتے قدموں کی آواز ابھرتی ہے۔ وہ سر باہر نکالتا ہے، میز پر چائے کی پیالی رکھی ہے اور تازہ اخبار۔ وہ دروازے کی طرف دیکھتا ہے تو اسے وہاں ایک عورت کا ہیولا نظر آتا ہے جو ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں ملبوس ہے اور سر دوپٹے سے چھپا ہوا ہے۔

کون؟ ماما ہے شاید، چائے دے کر چلی گئی!

چائے پینے کے بعد وہ پھر لیٹ جاتا ہے۔

اخبار کو گولی مارو بھلا اس میں کیا نئی بات ہوگی، وہی روزانہ کی خبریں، وہی روز کے حادثات، وہی گھسے پٹے بیانات اور بوسیدہ تصویریں، لیٹے رہو، لیٹے رہو!

اس کی بیوی پکارتی ہے، کیا بات ہے آج ناشتہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟

وہ چپ چاپ لیٹا رہتا ہے۔ پھر ساتھ والے کمرے سے اٹھا پٹک کی آوازیں آتی ہیں۔

اچھا تو اب گھر کی صفائی ہو رہی ہے —!

وہ کان لپیٹے لیٹا رہتا ہے ۔ ایک بار پھر دور سے اس کی بیوی پکارتی ہے: اٹھ کے ناشتہ کر لیجئے کب سے میز پہ لگا ہوا ہے پھر نہ کہئے گا کہ انڈہ پلاسٹک کا بنا ہوا ہے!

لو بھئی اب تو اٹھنا ہی پڑے گا، اب اٹھے بغیر چارہ نہیں —— اچھا بی بی صبح بخیر، دیکھو میں یہ غسل خانے میں گیا اور آیا!

وہ اپنے چہرے کی برسوں پرانی رکابی جلدی جلدی مانجھ کے ناشتے کی میز پر پہنچتا ہے۔ آج ناشتہ آہستہ آہستہ کرنے میں بھی ایک لطف ہے بات یہ ہے کہ ناشتہ ایسے ہی کرنا چاہیئے، پتہ نہیں روز ہم ناشتہ کرتے ہیں کہ دوڑ لگاتے ہیں!

وہ اطمینان سے چائے کی چسکیاں لیتا ہے۔

اس کی بیوی کی آواز آتی ہے: ذرا جلدی ناشتہ کریں ابھی کھانے کے کمرے کی صفائی ہونی ہے!

صفائی —— ارے بی بی گھر کی صفائی کو چھوڑو دل کی صفائی کی بات کرو، آؤ آج دونوں مل کے اپنے دلوں کے چراغ مانجھتے ہیں جن میں محبّت کا شعلہ جھلملاتا ہے!

کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی ہے۔ وہ پلٹ کے دیکھتا ہے تو اسے اپنی بیوی تو کہیں نظر نہیں آتی البتہ سامنے ہی صفائی کرنے والی مائی کھڑی ہے، بالوں کو دوپٹے میں چھپائے، بدن کو سمیٹے، ہاتھ میں جھاڑو اٹھائے۔

وہ کھانے کے کمرے سے باہر نکل آتا ہے اور کچھ دیر سلیپر گھسیٹتا لان پر چہل قدمی کرتا ہے۔ دھوپ ہو اور چھٹی ہو تو لان پر ٹہلنے میں جو مزا ہے، وہ بتایا نہیں جا سکتا، آہا!

سڑک کے سامنے سے ایک پڑوسی گزرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے: ارے آج آپ دفتر نہیں گئے، خیریت تو ہے؟

ہاں آج میں نے چھٹی لے لی تھی بس ایسے ہی! وہ اتنے فخر سے کہتا ہے گویا چھٹی کے
دن کے علاوہ چھٹی لینا ایسا کارنامہ ہے جسے صرف وہی سرانجام دے سکتا ہے۔
اچھا، اچھا، پڑوسی دانت نکوستا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔
وہ پھر ٹہلنے لگتا ہے۔
ہیرو میاں کس سوچ میں ہو؟ دن بھاگا جا رہا ہے اسے روکو، کچھ دل بہلانے
کی بات کرو، ٹہلنا چھوڑو اور چل کے زوجہ محترمہ سے چونچلیں کرو، بھلا ایسی فرصت کہاں
نصیب ہوتی ہے!
وہ اندر جاتا ہے۔
کسی کمرے سے اس کی بیوی کی آواز آتی ہے: آپ کہاں تھے، میں پوچھ رہی تھی کہ
آپ کی وہ قمیص کہاں ہے جو کل پہنی تھی اور گندے رومال اور موزے؟
وہ کہتا ہے: بی بی وہ تو وہیں پڑے ہیں میلے کپڑوں کی الماری میں ــــ مگر سنو
ذرا میرے پاس آ کے بیٹھو!
اچھا ــــ! اس کی بیوی جواب دیتی ہے اور پھر خاموشی۔
وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ سامنے والے کمرے میں اسے صفائی کرنے والی مائی گیلے
کپڑے سے فرش کی پونچھائی کرتی نظر آتی ہے۔ وہ اُکتا کے باہر نکل آتا ہے اور برآمدے
میں اخبار پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اخبار ہاتھ سے رکھ دیتا ہے۔
اب کیا ہو؟ اُدھر بہت دن سے کئی خط لکھنے ہیں تو کیوں نہ اس موقع سے فائدہ
اٹھایا جائے!
وہ کافی دیر تک خطوں کے چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ پھر وہ دوبارہ گھر میں جاتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ کمرے صاف ہیں، چادریں صاف ستھری بچھی ہوئی ہیں، کھانے کے کمرے میں ایک مکھی نہیں ہے، ڈرائنگ روم کی چمک دمک دیکھنے کے قابل ہے۔ فرش پر کہیں ایک تنکا نظر نہیں آرہا ہے۔

خوب، گھر کیا ہے آئینہ خانہ ہے مگر اس میں ہماری ہیروئن کی صورت کہیں نظر نہیں آتی، آخر وہ ہیں کدھر؟

وہ آگے بڑھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ صحن میں الگنی پر کپڑے لٹک رہے ہیں جن سے پانی ٹپک رہا ہے۔

اچھا تو کپڑے بھی دھل چکے ہیں، خوب ——!

وہ باورچی خانے کی طرف جاتا ہے،

اس کی بیوی کہتی ہے: کیوں کیا بات ہے بھوک لگ رہی ہے کیا؟ بس تھوڑا صبر اور کھانا تقریباً تیار ہے!

وہ باورچی خانے میں جھانکتا ہے۔ اندر اس کی بیوی تو نہیں ہے البتہ ماما گیس کے چولہوں پر جھکی ہوئی کھانا پکا رہی ہے۔ جب وہ مڑتی ہے تو اسے اس کی آنکھوں میں کٹی ہوئی پیاز سے پیدا ہونے والے آنسو بھرے نظر آتے ہیں اور ہاتھوں پر برتن مانجھنے کے سیاہ نشانات!

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ میز سے اٹھنے ہی والا ہے کہ باہر بس رکنے کی آواز آتی ہے اور ہارن بجتا ہے۔ بچوں کا شور، پھر دروازہ کھلتا ہے اور دونوں بچے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہیں اور بستے اٹھائے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ پھر جب وہ پائپ سلگاتا ہوا اپنی خوابگاہ میں داخل ہوتا ہے تو

اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دیتی ہے جو بچوں کو پکار رہی ہے۔

بے بی، گڈو چلو جلدی سے کپڑے بدل کے کھانا کھالو!

اخروٹ کی لکڑی کے بنے ہوئے پائپ سے بوسہ بازی کرتے ہوئے وہ بستر پر نیم دراز ہو جاتا ہے۔

اچھا تو جب بستر نصیب ہو ہی گیا ہے تو پتہ کرنا چاہیئے کہ خاتون انجمن آرا پر کیا گزری جو اس ناول کی ہیروئن تھیں جو کل رات میں نے پڑھتے ہوئے ادھوری چھوڑ دی تھی، خوب یاد آیا جب میں نے کتاب بند کی تھی اس وقت وہ اچانک گل بکاؤلی کی طرح غائب ہو گئی تھیں اور ان کا دیوانہ اور پرستار یعنی عاشقِ نامراد ان کی تلاش میں تھا پتہ نہیں اسے کامیابی نصیب ہوئی کہ نہیں، چلو دیکھتے ہیں!

وہ پائپ ایک طرف رکھتے ہوئے تکیئے کے نیچے سے کتاب نکالتا ہے۔

کچھ دیر بعد اچانک زور کا دھماکہ ہوتا ہے اور گیند آ کے زور سے کھڑکی سے ٹکراتی ہے۔ وہ چونک کے اٹھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ کتاب تو اس کے سینے پر پڑی ہے اور باہر بچے گیند بلے سے بے تکلف ہو رہے ہیں۔ وہ گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔

ارے حد ہو گئی گویا یہ دن بھی اب داغ مفارقت دینے والا ہے، کمال ہے اس طرح اڑنے چگنے میں دن گزرا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب شام ہونے کو آئی اور اب تو ٹی وی کے پروگرام شروع ہوئے بھی آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے۔

وہ بڑی سی جمائی لیتا ہے اور اٹھنے کا ارادہ کرتا ہے اسی وقت ایک بچہ عنابی رنگ کا ایک نامکمل سویٹر لے کے اس کے پاس آتا ہے: امی کہہ رہی ہیں ذرا پہن کے دیکھیں ٹھیک ہے؟

وہ کہتا ہے: ہاں ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے مگرامی سے کہو کہ آخر کچھ دیر کو میرے پاس بھی آئیں، انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا!

اس کی بیوی کہتی ہے: میں ابھی چائے بھیجتی ہوں!

وہ کہتا ہے: بابا میں چائے کے لئے نہیں چاہ کے لئے تڑپ رہا ہوں، ذرا سنو تو!

جواب میں قہقہہ اور صرف خاموشی!

چائے پینے کے بعد وہ ٹی وی کے سامنے جا بیٹھتا ہے۔ تھوڑی دیر میں بچے بھی وہیں پہنچ جاتے ہیں اور ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بن جاتے ہیں۔ ذرا دیر بعد پھر اس کی بیوی کی آواز آتی ہے: گڈو، بے بی چلو بہت ٹی وی دیکھ چکے اب اٹھ کے ہوم ورک ختم کرو، چلو! بچے منہ بسورتے ہوئے اٹھ جاتے ہیں تو وہ بھی جھلا کے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کمرے کی طرف جاتا ہے جہاں سے سلائی مشین چلنے کی آواز آرہی ہے۔ وہ اندر جھانکتا ہے، مشین پر بچوں کے کپڑے سلے رکھے ہیں مگر کوئی موجود نہیں ہے۔ وہ پھر باورچی خانے کی طرف جاتا ہے۔ اچانک باورچی خانے میں کچھ ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ وہ لپکتا ہے۔ فرش پر شیشے کی طشتری کے ٹکڑے پڑے ہیں اور سامنے ہی ماما اپنے زخمی ہاتھ پر پٹی لپیٹ رہی ہے۔

وہ پوچھتا ہے: ہاتھ زیادہ تو نہیں کٹا؟

نہیں! ٹھیک ہے! بگھے دوپٹے میں چھپے ہوئے سر کو جنبش ہوتی ہے۔

وہ اپنی بیوی کی تلاش میں جس کمرے میں جاتا ہے وہ وہاں موجود نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی اس کی آوازیں ضرور سنائی دیتی ہیں۔

آپ کل کون سے کپڑے پہنیں گے؟

آپ کے جوتے پالش ہو گئے ہیں !

آپ کے بلیڈ ختم ہو رہے ہیں کل نیا پیکٹ لیتے آئیں !

رات کے کھانے کے بعد جب وہ ٹی وی کے اختتامی پروگراموں سے دل خوش کر رہا ہے، اس کی بیوی اچانک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اندر داخل ہوتی ہے ۔

وہ کہتی ہے : بس اب سو جائیں صبح جلدی اٹھنا ہو گا !

وہ دیکھتا ہے، اس کی بیوی ہلکے نیلے شب خوابی کے لباس میں نیلم پری لگ رہی ہے اور اس کے شانوں پر کھلے ہوئے مہکتے بال !

یہ ہوئی نہ بات بالآخر، ہیروئن نے اپنا جلوہ دکھایا !

وہ اپنے بدن میں امڈتے ہوئے بادلوں کی گرج سنتا ہے ۔

اس کی بیوی کہتی ہے : ٹھہریں میں بچوں کو سلا کے آتی ہوں !

وہ بجلی بجھا کے بستر پر لیٹ جاتا ہے ۔ اس کے بدن کے درخت پر طوفان دستک دیتا ہے اور پتے کھڑکھڑاتے ہیں ۔ اچانک برابر کی مسہری چرچراتی ہے ۔ ہیرو اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے اور پھر اندھیرے میں درخت پر بجلی گرتی ہے ۔

کچھ دیر بعد جب ذرا مطلع صاف ہوتا ہے تو ہیرو، ہیروئن کے مہکتے بالوں کو سونگھتے ہوئے چپکے چپکے کہتا ہے : تمہیں کیا پتہ میں صبح سے تمہارے لمس کے لئے کتنا ترس رہا تھا، غضب خدا کا تم نے اس خوشبو کے لئے سارا دن تڑپایا، مجھے آج معلوم ہوا کہ محبوب کا انتظار بالکل مچھلی کے شکار کی طرح ہے، بس پانی میں بنسی ڈالے بیٹھے رہو، کیوں ؟

ہیروئن کسمساتی ہے پھر بڑی سی جمائی لے کر ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہتی ہے : اچھا جی اب ۔

اب کیا ۔۔۔ ؟

اب مجھے چھٹی ــــــ؟

چھٹی ــــــ؟ ہیرو کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے۔

اور نہیں تو کیا، اب سونا جو ہے، پھر سویرے اٹھنا ہے!

پھر وہ نیند سے بوجھل آواز میں بڑبڑاتی ہے: آپ کو پتہ نہیں مجھے صبح سے کتنے کام ــــــ! وہ اپنے بستر کی طرف جانے لگتی ہے۔

ہیروئن کا ہاتھ ابھی تک ہیرو کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہاتھ ذرا سختی سے دبوچتا ہے تو ہیروئن سسکی بھرتی ہے: اف میرا ہاتھ، بہت تکلیف ہے، انگلی کٹ گئی تھی نا شام کو! ہیرو ہاتھ ٹٹولتا ہے تو زخمی انگلی پر بندھی ہوئی پٹی اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور مچھلی غڑاپ سے اپنے تالاب میں۔

ہیرو دیر تک دم سادھے لیٹا رہتا ہے اور جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی ہیروئن دوسری صبح جلد اٹھنے کی آرزو دل میں بسائے گہری نیند سو چکی ہے تو وہ ٹیبل لیمپ روشن کر دیتا ہے اور تکیئے کے نیچے سے کتاب نکال کر خاتون انجمن آرا کی چٹپٹی داستان پڑھنے لگتا ہے جو اچانک گل بکاؤلی کی طرح غائب ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے قریب سوئی ہوئی ہیروئن کو دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ وہ تو غائب ہے اور اس کے پہلو میں ماما سو رہی ہے یا کپڑے دھونے والی عورت یا پھر صفائی کرنے والی مائی!

انکو بیٹر

مُرغیاں :

براؤن کوشن ، لیگ ہارن اور اسٹار کراس !

اس کے کانوں میں تلاوت کی آواز آئی ۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا ، اس کی بیوی جانماز پر بیٹھی تھی ۔

اس نے پھر سے لکھنا شروع کیا ۔

چُوزے : کُل عدد ــــــ

انڈے ــــــ

کل فروخت ــــــ

اچانک پَروں کی تیز پھڑپھڑاہٹ اُبھری اور مُرغیوں نے ہنگامہ کر دیا ۔ اس نے حساب کا کھاتہ ایک طرف سرکا کے سامنے دیکھا ۔

اوئے تمہارا ستیاناس ہو ــــــ یہ اچانک کیا مصیبت آگئی ؟

وہ اُٹھا ۔ جالی دار دیوار کے پیچھے مُرغیاں بے حد وحشت زدہ ہو رہی تھیں ۔ وہ آگے بڑھا تو نیم وا جالی دار دروازے سے ایک بلّی تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر نکلی ۔ اس نے دیکھا فرش پر ایک چتکبری مُرغی دم توڑ رہی تھی ۔ ابھی وہ اُس خونی بلّی کی کارگزاری

پریشان ہی ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی بیوی آ ٹپکی اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، مقتول کے سرہانے بین شروع کر دیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی بیوی اکثر ایسے حادثے پر جذباتی ہو جاتی تھی اور پھر مرحومہ سے تو اسے کچھ زیادہ ہی الفت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ ننھی سی چمکدار کلغی والی یہ حسینہ، تو مجھے کوئی ملکہ لگتی ہے جسے جادو کے زور سے مرغی بنا دیا گیا ہے ورنہ انڈے دینے کے سلسلے میں جس دریا دلی کا مظاہرہ وہ کرتی تھی اس کی توقع کسی عام مرغی سے نہیں کی جا سکتی، خیر اسی اندوہناک لمحے میں سائبان کے باہر موٹر سائیکل اپنے پر پھڑپھڑا کے اتری اور دروازے میں مسٹر کیکٹس کا رخِ خاردار مع اپنی بھوری داڑھی کے طلوع ہوا۔ موصوف کا نام تو کچھ اور تھا لیکن کیکٹس تخلص فرماتے تھے۔ کیکٹس نے اس المناک سچویشن کو اس کی بیوی کی منہ بسورتی آنکھوں سے بڑی تفصیل سے دیکھا اور پھر چیخ کر بولا ——— "پھر وہی ——— انکل تم آنٹی کو بہت تنگ کرتے ہو، بندۂ خدا کتنی بار کہا ہے کہ ان کی آنکھ میں آنسو نہ آنے دو مگر ——— آخر اب کیا ہوا؟"

اس کی بیوی نے کیکٹس کی حمایت کو غنیمت جانا اور اپنے ہونٹوں سے آنسو ٹپکاتے ہوئے کہا ——— "وہ مرگئی"!

"کون مرگئی" ——— ؟ کیکٹس نے پوچھا۔

وہ ——— اس کی بیوی نے منہ کھولا۔

اس نے بات اچک لی ——— "وہ مرگئی وہ، انڈے دینے والی ایک شیر دل مرغی، بس یہ سانحہ گزرا ہے"!

کیکٹس ہنس کے بولا ——— "تو کیا ہوا آنٹی، ایک مرغی گزر گئی تو کیا ہوا اور سینکڑوں

ہیں، ماشاءاللہ انکل نے اور کچھ تو کیا نہیں سوائے مُرغیوں کی نوادرات جمع کرنے کے!"

اس کی بیوی نے کہا ــــ "تم نہیں سمجھ سکتے۔ تمہیں کیا پتہ؟"

وہ بوجھل قدموں سے اندر چلی گئی۔

کیکٹس نے کہا ــــ "بیشک آنٹی بڑی زود رنج ہے مگر انکل تم واقعی سزا کے قابل ہو تمہیں اس کا جی بہلانے کو کچھ کرنا چاہیئے! بھلا بتاؤ اس مُرغی خانے میں اور کچھ ہے سوائے انڈوں اور مُرغیوں کے، جب آدمی صرف انڈوں اور مُرغیوں سے لو لگاتا ہے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے، میں سچ کہتا ہوں وہ تنہائی کے انڈے سہہ رہی ہے جس سے دُکھ کے بچے نکلتے ہیں!"

اس نے کہا ــــ "بابا مجھے پتہ ہے لیکن مجھے الزام نہ دو تمہیں شاید پتہ نہیں کہ ہم دونوں اپنے بچوں کی کلکاریاں سُننے کے انتظار میں اتنے تھک چکے ہیں کہ اب مُرغیوں کی کٹ کُٹ سے ہی ہمارا پیٹ بھر جاتا ہے!"

کیکٹس نے افسوس سے سر ہلایا اور بزرگوں جیسی سنجیدگی سے بولا ــــ "جو اللہ کی مرضی!"

"خیر سنو، وہ بولا، میں اس وقت صرف یہ کہنے آیا تھا کہ ویرانہ کلب میں جشنِ مہتاب ہے، لوگ گائیں گے اور ناچیں گے تم ضرور آنا اور آنٹی کو بھی ساتھ لانا کیا پتہ وہاں تم دونوں کو کچھ اچھی اچھی صحت مند مُرغیاں دیکھنے کو ملیں!"

اس نے کہا ــــ "اچھا تو تمہارا خیال ہے کہ تمہاری آنٹی ناچ دیکھ کے خوش ہوگی؟"

کیکٹس نے جواب دیا ــــ "ہاں ہاں کیوں نہیں، تم اسے خوش کرنے کی کوشش تو کرو!"

پھر رات تھی اور چاند تھا اور رقص تھا۔ اور وہ ویرانہ کلب کے سبزہ زار پر

بیٹھے تھے۔ ویرانے میں بڑی رونق تھی، موسیقی، روشنی، خوشبو۔

کیکٹس رقص کے ڈانس سے پرے برآمدے میں کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ برآمدے میں رنگین قمقموں کی جھالریں لٹک رہی تھیں اور دھنک رنگ غبارے فضا میں تیر رہے تھے۔

ایک بار کیکٹس اٹھ کے اس کے پاس آیا۔ "کہئے انکل کس دنیا میں ہیں، چاند اچھا ہے کہ ناچ اچھا ہے؟ اور آنٹی جان آپ تو خوش ہیں، کیسی جگہ ہے؟ اور ہاں آپ کو کوئی ستمگر، پسند آئی، ارد گرد اتنی ڈھیر ساری براؤن کوئن، لیگ ہارن اور اسٹار کراس مرغیاں اپنے اپنے مرغوں کے پروں میں منہ چھپائے ——!"

پھر ایک مرتبہ وہ خود اٹھ کے کیکٹس کے پاس گیا "معلوم ہوتا ہے تم بہت خوش ہو!"

"خوش؟ کیکٹس اداسی سے مسکرایا، میں دوسروں کو خوش دیکھ کے خوش ہوتا ہوں ورنہ جب سے میری مرغی بچھڑی ہے ——!"

اس نے حیرانی سے کہا —— "ارے تم تو بڑے اداس ہو!"

کیکٹس نے ہنس کے کہا —— "تو کیا میں یونہی کیکٹس بنا پھرتا ہوں، انکل ڈیئر تنہائی کے صحرا میں کیکٹس نہ پیدا ہوگا تو کیا کنول مسکرائے گا؟ خیر تم ناچ دیکھو اور آنٹی کا دل بہلاؤ!"

اس نے کہا —— "اب پتہ چلا کہ ہر شخص نے اپنے اندر خواہشوں کا پولٹری فارم کھول رکھا ہے، پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، معلوم نہیں کہ خوشی اصل میں کیا چیز ہے اور کتنے فاصلے پر ہے"؟ اسی وقت لڑکھڑاتے قدموں سے کوئی کاؤنٹر پر آیا۔

"چیونگم ہوگی"؟

"ضرور —— !کیکٹس نے چیونگم کے رنگ برنگے پیکٹ شیشے پر رکھے۔ شوکیس میں اور بہت سی چیزیں رکھی تھیں۔ ضرورت کا سامان!

اس شخص نے ٹٹولتی آنکھوں سے شوکیس کا جائزہ لیا۔

"اور یہ بھی ——!" اس نے اشارہ کیا۔

کیکٹس نے ہاتھ نیچے کیا۔ چھوٹے سے لفافے میں لپٹی ہوئی شے اس کے ہاتھوں سے خریدار کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ وہ شخص چلا گیا۔

اس نے پوچھا —— "یہ شخص کیا مانگ رہا تھا؟"

کیکٹس ہنسا —— "وہ بھی خوشی کے تعاقب میں ہے انکل، سنو یہ غباروں کی دنیا ہے اور جو نوجوان جوڑے دیر تک خود میں گم رہنا چاہتے ہیں غباروں سے کھیلتے ہیں!"

اب اس کی بیوی بھی اُٹھ کر کاؤنٹر کے پاس آگئی۔

"سنو وہ لڑکی کون ہے؟"

"کون سی؟" کیکٹس نے پوچھا۔

اس کی بیوی نے اشارہ کیا —— "وہ جو ابھی نیلے سوٹ والے کے ساتھ ناچ رہی تھی اور اب وہ دونوں برآمدے کے پاس بیٹھے ہیں!"

"اچھا —— کیکٹس ہنسا، وہ نوجوان جوڑا، گیس کمپنی کا انجینئر اور اس کی بیوی! یہ لوگ ابھی حال ہی میں یہاں آئے ہیں!"

اس کی بیوی نے خوش ہو کے کہا —— "خوبصورت جوڑا ہے!"

اس نے کہا —— "اچھا لڑکا ہے!"

اس کی بیوی بولی —— "پیاری لڑکی ہے!"

پھر یکایک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے پوچھا —— "کوئی بچہ نہیں ہوا اب تک؟"

کیکٹس ہنس پڑا ــــ " شاید نہیں، ابھی تو وہ خود بچے ہیں آنٹی ڈیئر، وہ ایک دوسرے سے بہت خوش ہیں!"

" خوش ــــ ؟" اس کی بیوی نے ناگواری سے منہ بنایا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے تیزی سے کہا، " چلو اب گھر چلیں، کل سویرے مرغیوں کو ٹیکے لگوانے ہیں!"

اس کی بیوی آگے بڑھی تو اس نے کیکٹس سے سوال کیا " کیا وہ دونوں روز یہاں آتے ہیں؟"

" کیوں ــــ کیکٹس مسکرایا ــــ کیا متعارف ہونا چاہتے ہو، ابھی تو میں بھی ان سے ٹھیک طرح نہیں ملا ہوں لیکن انہیں آتے جاتے ضرور دیکھتا ہوں، شاید انہیں بھی برج کا شوق ہے، سوئمنگ کا بھی اور اسنوکر ــــ !"

پھر جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر آرہا تھا تو اس نے لڑکے کو اپنے پُرجوش چہرے کی رفاقت میں کاؤنٹر کی طرف بڑھتے دیکھا۔

رات میں اس کی بیوی کو تیز بخار چڑھ آیا اور وہ سوتے میں بڑبڑاتی رہی۔ اسے وہ مقتول چتکبری مُرغی اب تک یاد تھی۔ اس کے باوجود وہ صُبح نماز کے لئے اُٹھی اور دیر تک دعائیں مانگتی رہی، یا خدا! یا خدا!

نماز کے بعد وہ پھر لیٹ گئی اور تھکی تھکی نظروں سے اسے کھڑکی کے پار مُرغی خانے میں کام کرتے دیکھتی رہی۔ ایک بار اُس نے پوچھا ــــ " کہو تو میں تمہارے پاس آبیٹھوں اور اخبار سناؤں؟"

اس کی بیوی نے کہا ــــ " نہیں تم اپنا کام کرو میں تمہیں یہیں سے دیکھوں گی!"

اُسے مُرغیوں کے جالی دار ڈربوں اور ان کے پانی کے برتنوں کی صفائی کرتے ہوئے اور

انہیں ٹیکے لگواتے ہوئے بار بار اپنی بیوی کا خیال آتا رہا۔ وہ رات بھر میں کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ واقعی بعض صدمے کیسے بلائے جان ہوتے ہیں! اسے اب سارا کام اکیلے کرنا پڑ رہا تھا، مرغیوں کو دانہ کھلانا، انکوبیٹر میں رکھے ہوئے انڈوں کی نگہداشت، نوزائیدہ چوزوں کا استقبال اور ان کے طعام و قیام کا بندوبست!

انکوبیٹر کے وجود میں بھڑکتی ہوئی گرمی اسے ماتا کی آگ کی طرح محسوس ہوتی جو بے جان انڈوں میں بھی زندگی کی رمق دوڑا دیتی تھی۔ وہ انکوبیٹر کا دروازہ کھولتا تو اسے بیک وقت بہت سارے چوزوں کی چوں چوں کا آہنگ سنائی دیتا۔ یہ منظر اسے عجیب لگتا۔ انکوبیٹر کی گرم آغوش میں تخلیق کی منزلیں طے ہوتی تھیں۔ اس کے اندر ایک دُنیا تھی کبھی دُنیا بھی اسے ایک انکوبیٹر کی طرح محسوس ہوتی —— ایک وسیع و عریض انکوبیٹر جس میں ہر مخلوق ازل سے افزائشِ نسل کے عمل سے گزرتی چلی آرہی تھی، اور بیشک اس میں آنکھ والوں کے لئے بڑی عبرت ہے، اس میں شک نہیں کہ خدا...... آسمانی لفظوں کی پھوار اس کے دل پر گرتی۔

وہ انکوبیٹر سے مرعوب تھا اور اس کی بیوی کو انکوبیٹر سے محبت تھی۔ وہ اس کی صفائی اس احترام سے کرتی گویا جانماز جھاڑ رہی ہو۔

اس نے مڑ کے دیکھا، اس کی بیوی کھڑکی کے پاس لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں چھت پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ اسے یہ سوچ کر دُکھ ہوا کہ اللہ کی بندی اچانک بیمار ہو گئی ورنہ وہ بھلا اسے تنہا کام کرتے دیتی۔ بیچاری!

پھر باہر موٹر سائیکل کے رُکنے کی آواز آئی اور کیکٹس ہوا کے سرکش جھونکے کی طرح اندر گھسا۔

"کیا بات ہے ــــ؟ وہ بولا آج فضا غیر معمولی طور پر اداس کیوں ہے ؟ اور آنٹی کہاں ہیں ؟"

اس نے انکوبیٹر میں رکھے ہوئے انڈوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میاں وہ تو بیمار ہے ، رات ہم واپس آئے تو اسے تیز بخار ہو گیا ــــ!"

"ارے تو کیا اس ناہنجار مرغی کا اس قدر دکھ ہوا انہیں ؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے انڈوں کے رخ پھیرتا رہا۔

کیکٹس نے کہا ــــ "خیر اللہ صحت دے گا ، فکر مت کرو !"

پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر کی طرف چلے - اس نے پوچھا ــــ "رات وہ دونوں کب تک رہے ؟"

کیکٹس نے جواب دیا ــــ "بس وہ بھی چلے گئے تھے اسی وقت لیکن ــــ!"

"لیکن کیا ــــ؟" اس نے سوال کیا۔

کیکٹس نے کہا "عجیب بات ہوئی جب وہ کاؤنٹر پر آیا تو میں نے چیونگم کے پیکٹ شیشے پر رکھے اور اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا ، مجھے پتہ ہے آپ کو کیا چاہیئے ، مجھے آپ جیسے لوگوں کی خدمت سے خوشی ہوتی ہے !" وہ مسکرایا پھر اس نے کہا "لیکن اس وقت مجھے صرف ایک نپل چاہیئے جو دودھ پلانے کے کام آتا ہے۔ اس نے شوکیس میں رکھے ہوئے ربڑ کی طرف اشارہ کیا اور بولا میرا بیٹا ذرا نخریلا واقع ہوا ہے ، اسے یہ پسند ہے !"

کیکٹس کی آواز اس کی بیوی کے کان میں گئی تو اس نے چونک کے پوچھا ــــ "کس کا بیٹا ؟"

اس نے کہا ـــ "رات والا بوڑھا تمہیں یاد ہے، ان کا ایک بیٹا ہے!"

"سچ ـــ؟" اس کی بیوی سنبھل کے بیٹھ گئی، پھر بولی، "یقیناً پیارا بچہ ہوگا، وہ دونوں خود جو اتنے پیارے ہیں!" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر روشنی ہوگئی ـــ پھر وہ اچانک کچھ سوچتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر جانے لگی۔

کیکٹس نے کہا ـــ "ارے آپ کہاں چلیں آنٹی ڈیئر آپ کو بخار ہے!"

"بخار ـــ وہ بولی، نہیں تو!" وہ ہلے ہلے ڈگ بھرتی آگے بڑھی۔ جالی دار دروازوں کے پیچھے مرغی کے ننھے ننھے بچے اچھلتے کودتے پھر رہے تھے۔ اس نے ایک بچے کو جھپٹ کے اٹھایا اور اس کی پیلی چونچ کو اپنے پھڑپھڑاتے ہونٹوں سے چوم کے بولی ـــ "کہو کیا میں تمہیں بیمار لگتی ہوں؟" پھر وہ مڑی اور پرجوش لہجے میں اس سے کہنے لگی ـــ "اے تم انکوبیٹر کو نہ چھونا اسے میں خود ـــ!" وہ مسکرائی تو اس کی آنکھوں کے پھول کھل اٹھے جن پر خوشی کے آنسوؤں کی نمی تھی۔ اس نے مسکرا کے کیکٹس کو دیکھا اور اس کے اداس دل پر آسمانی لفظ بارش کے قطروں کی طرح اترنے لگے: بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے!

لفظوں کا اہرام

پہلا کتبہ

یہاں پر وہ شخص دفن ہے۔ جس کی آنکھیں بہت قیمتی تھیں کہ وہ صرف سچائی کو دیکھتی تھیں۔ جس کے کان بہت قیمتی تھے کہ وہ دور کی آواز سنتے تھے جو سچائی کے پہاڑ سے آتی تھی۔ جس کی زبان بہت قیمتی تھی کہ وہ حق گو تھی اور جس کا دل بہت قیمتی تھا کہ اس میں خوبصورت جذبے جنم لیتے تھے مگر اس کا بدن مطلب پرست تھا اور وہ ساری عمر اپنے جیسے دوسرے بدن کی طلب میں سلگتا رہا!

"یہ کتبہ ہے کہ مرثیہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے کھردرے ہاتھوں میں بھینچ لیا اور سنجیدگی سے بولا۔

واقعہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ میری قبر پر یہی کتبہ نصب کیا جائے، سوچو کتنا بڑا المیہ ہے کہ آتنا چاہنے کے باوجود بھی میں تمہیں نہ پا سکا۔ تم کہو گی جھوٹ، شاید میں نے تمہاری آرزو نہ کی لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے میں نے تمہارے علاوہ کوئی اور تمنا نہ کی۔

یقین کرو تم میری سب سے بڑی آرزو تھیں لیکن میں چاہتا تھا کہ حالات ٹھیک ہو جائیں اور میں کسی قابل ـــــ لیکن میں جتنے سال تمہارے ساتھ پڑھتا رہا خود کو تمہارے قابل بنانے کی آرزو میں تم سے دور ہوتا چلا گیا، دور اور دور ـــــ تمہاری دُنیا اور تھی ـــ!

سنتری نے چلّا کے کہا، ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے!

قیدی اٹھا اور نم ناک آنکھوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔

وہ نم آلود آنکھیں، وہ بھیگے ہوئے رخسار مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ڈائری میرے سامنے ہے اور قلم ہاتھ میں ہے۔

میں ڈائری لکھتی ہوں، بہت عرصے سے لکھ رہی ہوں، لکھتی چلی آرہی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری شادی نہیں ہوئی تھی تو میرے گھر والے اسی عادت کی وجہ سے بے بی ڈائری کہہ کے پکارتے تھے۔

مجھے سُرخ رنگ کی ڈائری پسند ہے۔ مجھے سُرخ کپڑے بھی اچھے لگتے ہیں۔ جب میں دلہن بنی تھی تو مجھے لگا تھا کہ جیسے میں خود ایک ڈائری ہوں جس کے صفحات پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسے رسم الخط میں جسے اب تک کسی نے نہیں پڑھا۔

نا تمام آرزوئیں

نا آسودہ خواہشیں

مستقبل کے خواب!

میری ڈائریاں ـــــ یادوں کی آرٹ گیلریاں جن میں تصویریں لگی تھیں۔

گزرے واقعات!

بھولے بسرے دوست!

بچپن کے سپنے !
جلتے بجھتے قمقمے !
دھنک رنگ تتلیاں اور مور کے پر !
دن اچھے تھے۔
راتیں اچھی تھیں۔
گھر اچھا تھا۔ یہ گھر جس میں صرف میں تھی اور عارف تھا۔
ایک دن عارف کہنے لگا "تم نے مجھے کیسا پایا ؟"
"اور میں تمہیں کیسی لگی ؟"
"بہت اچھی، بہت سلیقہ مند، بہت شائستہ !"
بہت مہربان، بہت باذوق، بہت کشادہ دل !
میں ڈائری لکھتی ہوں۔
میں ڈائری لکھتی رہی۔
میں ڈائری لکھتی رہتی۔
جو کچھ ہوا، بالکل اچانک ہوا۔
اور اس دن مجھے وہ کتبہ بہت یاد آیا، وہی کتبہ جو اس نے کہا تھا کہ اس کی قبر پر
نصب کیا جائے۔
مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا ؟
شاید جیل میں
شاید کہیں اور

شاید کہیں بھی نہیں

مجھے تو پتہ نہیں تھا اور میں ڈائری لکھتی رہتی

پھر اچانک پتہ چلا کہ وہ تو مر گیا۔

نجانے وہ کون سا دن تھا۔ شاید عام سا دن تھا، یونہی سا جیسے سارے دن ہوتے ہیں۔ مگر اس دن میں بہت خوش تھی اور اخبار میں تازہ فلموں کے اشتہار دیکھ رہی تھی کہ اچانک ایک صفحے پر چھوٹی سی سُرخی پر نگاہ پڑی۔ طالب علم لیڈر کی جیل میں وفات،

"مشہور شاعر، طالب علم لیڈر اور انقلابی جناب (اس کا نام) کل پراسرار حالات میں جیل کے اندر مردہ پائے گئے۔ باور کیا جاتا ہے کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔

اور پھر مجھے وہ کتبہ اچانک یاد آیا۔

یہاں پر وہ شخص دفن ہے جس کی آنکھیں ——————

جس کے کان ——————

جس کی زبان —— جس کا دل ——

مگر جس کا بدن ——

وہ کتبہ مجھے بہت یاد آیا۔

شاید میں روئی بھی یا شاید نہیں روئی، شاید مجھے اس خبر سے بہت زیادہ صدمہ ہوا یا شاید نہیں ہوا، میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔

البتہ وہ دن مجھے بڑا بے تکا سا لگنے لگا۔ اور میں نے یہ سب باتیں پوری سچائی کے ساتھ اپنی ڈائری میں لکھ دیں، یہ تمام باتیں، یہ تمام یادیں —— پرچھائیاں، کہتے ہیں کسی ہمدرد کے آگے اپنا دُکھڑا بیان کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اور ڈائری تو

میری سہیلی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ جب میں سو کے اٹھی تو طبیعت ٹھیک تھی لیکن گھر اداس تھا۔ ذہن پہ ایک غبار سا چھایا ہوا تھا اور ہر چیز بدنما لگ رہی تھی۔

شام کو عارف کہنے لگا — تمہیں یاد ہے محترمہ آج پکچر دیکھنے کا پروگرام ہے!

ہاں تھا تو سہی لیکن آج ملتوی!

"کیوں —؟" عارف نے پوچھا، میں نے تو فلم کی خاطر دوستوں کی ضیافت چھوڑ دی ہے!

کوئی بات نہیں — میں نے جواب دیا، کل چلیں گے!

"کیوں —؟"

آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں!

فلم اچھی ہے، طبیعت بھی اچھی ہو جائے گی!

میں نے کہا نا کہ آج نہیں!

آخر آج کیوں نہیں؟ عارف کو بھی جیسے ضد سی ہو گئی تھی۔

میرا جی اداس ہے!

کیوں اداس ہے جی! عارف کے منہ سے برف کی ڈلیاں گر رہی تھیں۔

بس ایسے ہی!

ایسے ہی کیوں؟

خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو! میں نے چڑ کے کہا۔

اچھا — عارف کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی، تو یوں کہو کہ سوگوار ہو؟

اس نے ایسے کہا جیسے کہ راز افشا کر رہا ہو، پھر بولا، ہاں بھئی ٹھیک تو ہے جب کوئی عزیز دوست مر جائے تو پھر ——— !

میں فرطِ حیرت سے پتھر ہو گئی۔ ہاں میں نے دھماکے کی آواز سنی تھی اور خود کو یخ بستہ چٹانوں تلے دبا ہوا پایا تھا۔ میں اسے حیران ہو ہو کے دیکھ رہی تھی لیکن عارف مجھے کہیں نظر نہ آیا اس کی جگہ ایک ہیولا سا رہ گیا، دھوئیں کا مرغولا! اس کے چہرے کے نقوش نفرت کی حدت سے پگھل گئے تھے اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ میں سوچ رہی تھی، میں حیران تھی، کیا یہی میرا عارف تھا، میرا خوبصورت عارف! میرا شریکِ حیات، میرا سرمایہ! اس کے تصور سے کیا کیا چیزیں زندہ تھیں، خوب صورت آنکھیں، خوبصورت دل اور مسکراہٹوں کی جگمگاتی تھالیوں میں اس کی باتوں کی مہکتی الائچیاں! مگر اس وقت اس کے ہونٹوں کے چقماق میری طرف شعلے اچھال رہے تھے۔

تمہیں تو اس سے محبت تھی نا ——؟

تمہیں تو وہ بہت پسند تھا، وہ ذہین آدمی، شاعر، انقلابی، وہ سچا آدمی، وہ مردِ قلندر ——— کیوں؟

اور مجھے پس منظر میں اپنی ڈائری کے پھڑپھڑاتے صفحوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

تو میں سچ مچ پتھر ہو گئی تھی۔ میں اب تک پتھر بنی ہوئی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طلسم سے کیسے نجات حاصل کروں، وہ کون سا منتر ہے جس سے میری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں پھر سے روشنی آئے گی اور میرے منجمد وجود میں محبت کا کوندا لپکے گا ——؟

شاید عارف یہ انکشاف کرنا چاہتا تھا کہ وہ شوہر ہونے کی حیثیت سے میری تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے، میں کیا کرتی ہوں اور کیا کرتی رہی ہوں؟ میں اسے اپنا دوست سمجھتی

تھی مگر وہ تو صرف میرا مالک نکلا۔ عارف کتنا اچھا تھا، کتنا پیارا مگر اس مختصر سے ملیے کے دوران جب اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ چھپ چھپ کے میری ڈائری پڑھتا رہا ہے مجھے کتنا بدصورت اور کتنا مکروہ معلوم ہوا!

مجھے حیرت ہے، سخت حیرت ہے کہ لوگ اپنی بیویوں کو جاننے کے لئے ان کی ذاتی ڈائریوں کا سہارا کیوں لیتے ہیں، چھپ چھپ کے دریچوں سے کیوں جھانکتے ہیں؟ کیا وہ اس کے بغیر ان کی رُوح تک نہیں پہنچ سکتے؟ عورت تو کتنی تنہا ہے؟

مجھے تم پر کتنا اعتماد تھا میرے دوست مگر تم نے اسے اچانک کتنا نقصان پہنچایا۔ کیا تمہیں میری وفا پر شک تھا؟ کیا تمہیں میری محبت کا یقین نہیں تھا؟ اور سنو کیا تم سمجھتے تھے کہ میں محبتوں کی قدر نہیں کرتی، یقین کرو میں تمہاری سب سے زیادہ دوست تھی۔

تو اب جبکہ اعتماد کا پُل ٹوٹ چکا ہے اور ہم دونوں پھر سے ندی کے دو کناروں پر کھڑے ہیں ہمارے پاس ایک دوسرے کے لئے کیا رہ گیا ہے سوائے لذتِ بدن کے اس بے معنی اوورکوٹ کے جو ہماری دا غدار رُوحوں نے اوڑھ رکھا ہے ___؟ تو کیا اب یہ نتیجہ نکالا جائے کہ زندانِ ہستی میں مقید ہماری رُوحوں نے جب تک یہ اوورکوٹ پہن رکھا ہے ہم اپنی خواب گاہ میں ایک دوسرے کو خوشدلی سے برداشت کرتے رہیں گے کیونکہ ہم نے بیشمار گواہوں کے سامنے دمِ آخر تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا کھوکھلا عہد کیا تھا ___ لعنت! تو کیا زندگی کڑھتی رُوح اور مسکراتے ہونٹوں کے درمیان بے معنی توازن قائم رکھنے کی مسلسل کوشش کا نام ہے؟ اور وہ جو زندہ رہنے پر مُصر ہیں کیا کہلاتے ہیں؟ اور کیا جیتے رہنے کو ریاکاری کہتے ہیں؟ تو کیا ایسا نہیں کہ اب جبکہ حالات کچھ اور

ہیں اور واقعات کا دھارا مجھے پتّے کی طرح بہائے لئے جاتا ہے زندگی کے مقابلے میں موت قابلِ ترجیح ہے ؟ موت جو سب کو پوری سچائی کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ وہ کوئی تفریق نہیں کرتی۔ موت کسی کو گلے لگانے کے لئے ذاتی ڈائریاں نہیں کھنگالتی۔ تو کیا میں موت سے محبت کرنے لگی ہوں، شاید ــــ اور شاید اس لئے کہ موت کو اختیار کرنا آسان ہے ــ خواب آور گولیاں، تھوڑی سی ہمت اور بس ! نہ اسے اپنی دفا کا یقین دلانے کی ضرورت ہے نہ دل بہلانے کی حاجت ــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ موت دفا کا پیکر ہے !

تو سنو میری بہن وہ جو پہلا آدمی تھا نا وہ تمہاری طرف دیکھ دیکھ کے للچاتا رہا اور بس، اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ تھی اور تم اس کے سامنے کسی دیوی کی طرح ایستادہ رہیں ــــ تو یہ تمہاری پہلی موت تھی ــــ ایک عورت کی پہلی موت، جب محبت انا کی سیڑھی سے نیچے نہ اتر سکی۔ اور یہ دوسرا شخص جو تمہارے قریب آیا تو وہ خود کو دیوتا سمجھتا رہا اور تم بیچاری ہمیشہ سے اپنی انا کی مریض تھیں تو میری جان شادیاں جو ہوتی ہیں نا وہ مردوں اور عورتوں کی ہوتی ہیں، دیویوں اور دیوتاؤں کی نہیں ہوتیں، کیا سمجھیں ؟

تو پھر ؟

تو کیا تم اب بھی یہ تسلیم نہ کرو گی کہ تم عورت ہو کوئی دیوی نہیں ہو، اور سنو تم جو انا کے پہاڑ پر کھڑی ہو تو کیا اتنی بلندی پر تمہارا دم نہ گھٹ جائے گا، تمہیں محبت کی آکسیجن چاہیئے ــــ لیکن کس لئے ــــ کیا زندہ رہنے کے لئے جو محض ریاکاری کا عمل ہے، خواہشوں کی غلامی کا اور اپنے نہ ہونے کی حقیقت پہچاننے کا، اللہ یہ زندگی موت سے کتنی کمتر ہے ــــ مجھے سچائی پسند ہے اور موت سچائی ہے۔

اچھا تو ــــ !

مگر یہ کیا، یہ رونے کی آواز؟
اوہ ندیم رو رہا ہے شاید، سوتے میں اٹھ گیا، اچھا بیٹے ٹھہرو!
وہ ڈائری بند کر کے سرہانے والی میز کے خانے میں بند کر دیتی ہے۔

آخری کتبہ

رات کا پچھلا پہر ہے۔ نیم تاریکی میں عارف چپکے
چپکے آتا ہے اور میز کے خفیہ خانے سے ڈائری نکالتا ہے۔
وہ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں ڈائری کھولتا ہے۔ پھر وہ
صفحات پلٹتا ہے:

ایک صفحہ، دوسرا صفحہ، تیسرا صفحہ ——

تمام صفحات، تمام اوراق سادہ ہیں اور ان پر کچھ تحریر نہیں۔
وہ حیران ہو کے پہلو میں دیکھتا۔ وہ سرخ کپڑوں میں
سو رہی ہے، اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے اور اس
کی چھاتی کا زیر و بم ——

عارف ڈائری میز کے خانے میں رکھ دیتا ہے،
جو سرخ رنگ کی ہے اور پھر تکیئے سر پر رکھ کے برابر
والی قبر میں لیٹ جاتا ہے۔

دی بُلز

اخبار ان کے ہاتھ میں کسی سرکش پہاڑی پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا۔ اشتہاروں کے صفحے پر ایک تصویر چھپی تھی۔ لمبے بالوں والے لڑکے ہاتھوں میں گٹار لئے کھڑے تھے ان کی آنکھوں میں باغیانہ چمک تھی اور ان کے کھنچے ہوئے ابرو اور چہروں کے تیکھے نقوش یوں لگتے تھے جیسے ابھی بول اُٹھیں گے۔ درمیان میں ایک چہرہ ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لئے مبہوت ہو گئے۔ چہرہ کیا گویا ایک آئینہ تھا جس میں انہوں نے کئی بار اپنے عکس کو طلوع ہو کر غروب ہوتے دیکھا پھر انہوں نے خود سے پوچھا۔ "شرافت مرزا کیا یہ تم ہو؟"

چہرہ مہرہ وہی تھا، وہی کشادہ پیشانی، وہی ستواں ناک اور ہونٹوں کے گوشوں میں دبکی ہوئی ملائم مسکراہٹ! پھر جیسے ایک بچہ ہمک کر ان کی گود میں آ گیا۔

کسی نے کہا۔ "ہو بہو باپ کی صورت!"

بچہ انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بچے کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھتے رہے پھر بچہ مسکرایا اور اس نے ہاتھ بڑھایا اور بے تکلفی سے ان کی ناک پکڑ لی، کئی قہقہے اور کئی تالیاں۔

انہوں نے سر جھٹکا تو اخبار کا کھلا ہوا صفحہ ان کے سامنے تھا، لمبے بالوں اور تیکھے خطوط والا بانکا نوجوان ہونٹوں میں مسکراہٹ دبائے، گٹار ہاتھوں میں تھامے انہیں بغور

دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے کہا۔ "ہاں شرافت مرزا یہ تمہارا نیا روپ ہے!

آدمی کتنے روپ بدلتا ہے، انہوں نے کہا، چمڑے کی جیکٹ، کوڑیوں کی مالا، تسموں والے پائینچوں کی پتلون، ربڑ کی بدہیئت جوتے، انہوں نے کہا "بعض اوقات عزیز ترین چہروں کو بھی پہچاننا کتنا مشکل ہوتا ہے، کیا میں خود کو بھول رہا ہوں۔ بتاؤ شوکت مرزا تم جو شرافت مرزا کا نیا رُوپ ہو؟

گٹار کے تار جھنجھنائے اور ایک نوجوان کی آواز اُبھری ــــــ "میرا نام شوکی ہے!

"شوکی؟ مگر میں نے تو تمہارا نام شوکت مرزا رکھا تھا یاد نہیں تمہارے دادا کا نام صولت مرزا تھا، وہ صولت مرزا جن کی روغنی تصویر بڑے کمرے میں لگی ہے اور ان کی پوچھتی آنکھیں تمہارے تعاقب میں ہیں۔ ان کا رُعب و دبدبہ، بہادر راجپوتوں کی سی چتون، آہن پوش کلائیاں اور تلوار کے منقش قبضے پر ان کی مضبوط گرفت، تم نے تو اس تصویر کے سائے میں آنکھیں کھولی ہیں، بھلا تم شوکت مرزا سے شوکی کیسے ہو گئے؟

"بابا جان ہم رُوحوں کی تطہیر اور لطافت کے قائل ہیں۔ بے معنی ناموں کا بوجھ ہمیں گوارا نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ نام بھاری بھر کم ہو تو شخصیت دب جاتی ہے! میرا نام شوکی ہے اور میری بہن ہنی ہے کیونکہ ہم نے تصویر کی دوسری طرف جنم لیا ہے میں صرف شوکی ہوں اور ہنی سب کے لئے ہنی ہے۔ اگر اب کوئی اسے حنیفہ کہے گا تو اس پر ظلم کرے گا!

"مگر تمہارے دادا کی تصویر؟

تصویر تو کب کی دھندلا چکی بابا جان اب لکڑی کے بوسیدہ چوکھٹے میں مٹی کی ایک دیوار ہے جس کی ضرورت اب صرف اس لئے ہے کہ اس کی پُشت پر گوریا کا ایک خاندان

پل رہا ہے اور ان کا گھونسلہ دن بدن پھیلتا جاتا ہے!"

"سُنا اُمِّ لیلیٰ تم نے سُنا، اب انہیں تصویر کی پہچان بھی نہیں رہی، کیا سچ مچ تصویر دھندلا گئی ہے؟"

اُمِّ لیلیٰ نے آئینہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے سر میں جا بجا چمکتی ہوئی چاندی کو خضاب سے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ان کی نظریں تیز ہیں اور وہ تم سے زیادہ دیکھ سکتے ہیں!"

توپھر اس تصویر کو صاف کراؤ اس پر گرد کی چلمن ہے۔ میں یہ قطعی برداشت نہیں کرسکتا کہ وہ اس تصویر کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیں!"

اُمِّ لیلیٰ کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ اُبھری، اس نے کہا۔

مگر تم کس کس چیز کا شکوہ کروگے، انہیں اپنے مطالبات زیادہ عزیز ہیں!"

"تم یہ برداشت کرسکتی ہو اُمِّ لیلیٰ؟"

اُمِّ لیلیٰ نے کہا ـــــ "ہم تم تو اب صرف برداشت کرنے کے لئے جی رہے ہیں، تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا ہوگا، تمہیں برداشت کرنا ہی پڑے گا!"

"اُمِّ لیلیٰ تم انہیں سمجھاتی نہیں تم ماں ہو، شوکت مرزا کی ماں!"

"شوکت مرزا؟" اُمِّ لیلیٰ نے کہا ـــــ "شوکی کہو اسے احتجاج کا موقع نہ دو!"

"مگر یہ کوئی نام نہیں ہے!

"پھر کیا ہے؟"

مجھے تو یہ کوئی تلفظ کی غلطی معلوم ہوتی ہے!

اُمِّ لیلیٰ ہنسی، "تم تصویر کے بہت قریب کھڑے ہو تمہیں معلوم نہیں اس کے پیچھے

چڑیوں کا گھونسلہ ہے، ہٹ جاؤ کہیں انہیں ڈرا نہ دینا!"

اُمِ لیلیٰ آئینے کے سامنے سے اُٹھیں۔ "شوکی تمہارا بیٹا ہے تم کیا چاہتے تھے آخر وہ کیا ہو؟ تم اسے کس رُوپ میں دیکھنا چاہتے تھے؟" انہوں نے گلاس میز پر رکھا اور فریج کھولا۔ "شوکی میرا نیا رُوپ ہے میری خواہش تھی کہ وہ اس تصویر سے میری طرح محبت کرے، میری خواہش تھی کہ.....!"

اُمِ لیلیٰ نے کہا — "خواہشوں کو رہنے دو، ہم خواہشوں کے دائمی مریض ہیں۔ میری خواہش تھی کہ اس وقت ٹھنڈا پانی پیوں مگر بوتل خالی ہے!" انہوں نے فریج بند کر دیا۔ اور ڈائننگ ٹیبل سے جھوٹی پلیٹیں اٹھائیں اور کچن میں جا کے سنک میں ڈال آئیں

اُمِ لیلیٰ نے کہا — "شوکی کو آزادی کی خواہش ہے، ہنی کو بے فکری کی خواہش اور وہ لڑکی جو ہماری بہو بننے کے خواب دیکھ رہی ہے!"

"کون — ؟ کون ہے وہ لڑکی؟"

اُمِ لیلیٰ نے کہا — "تم اسے ایک بار دیکھ چکے ہو، مجھے یقین ہے کہ تمہیں اسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہیں ہوگی۔ وہ شوکی کے ساتھ ایک دن یہاں آئی تھی!"

"کون وہ فرانسیسی ہپی لڑکی جس کے پاؤں میں ناسُور ہے؟"

"ہاں مگر وہ پاپ گروپ POP GROUP کی ایسی رُکن ہے جس کی آواز ہی اس کی شخصیت ہے!"

"لیکن شوکی؟"

"شوکی نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے، وہ لڑکی جیت گئی، وہ غیر ملکی لڑکی!" اُمِ لیلیٰ نے افسردگی سے کہا۔

"نہیں" انہوں نے شکستہ دلی سے کہا۔۔۔ "یہ کیسے ممکن ہے ؟"

اُمِّ لیلیٰ نے کہا۔۔۔ "میرے ساتھ آؤ تحریریں جھوٹ نہیں بولتیں !"

پھر شوکی کے کمرے میں سچائی مل گئی۔ میز کی درازوں اور بستر کی تہوں کے اندر کاغذات میں سچائی مہک رہی تھی۔ تکئے کے اندر سے ایسی تصویریں نکلیں جن میں سچائی اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ شوکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط بھی نکلا جس میں حرف حرف سچ تھا۔ اس نے لکھا تھا، "جان ! مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں صرف ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اگرچہ یہ حیرت انگیز ہے کہ ہم لوگوں کی ملاقات اب ہوئی ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے، ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔ میں تمہاری خاطر تمہارے پاپ گروپ POP GROUP کا رکن بننے میں فخر محسوس کرتا ہوں اور یہ عہد کرتا ہوں کہ جہاں جہاں تم جاؤ گی وہاں وہاں میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ مجھے اس فیصلے پر اپنے گھر میں کسی خاص مزاحمت کا احتمال نہیں، مادرِ گرامی بے ضرر ہیں اور اولڈ مین کو وقت کا دھارا راہ راست پر لے آئے گا، بفرضِ محال اگر کسی جانب سے مخالفت ہوئی بھی تو میں تمہارے وجود کی قسم، آخری دم تک اپنے حق خود ارادیت کی جنگ لڑتا رہوں گا، یہ میرا فیصلہ ہے !"

اُمِّ لیلیٰ نے کہا۔۔۔ "تمہارے گھر میں بغاوت ہو گئی ہے !"

انہوں نے کہا۔۔۔ "مگر جنگ کس کے خلاف ہے ؟"

اُمِّ لیلیٰ نے کہا۔۔۔ "اس تصویر کے خلاف ! کیا تم اب بھی اس کے حق میں ہو ؟"

انہوں نے کہا۔۔۔ "مٹی کی اس دیوار میں میری جان ہے، تم بھولنا نہیں !"

اُمِّ لیلیٰ نے کہا۔۔۔ "تم اب کیا کرو گے ؟"

انہوں نے کہا۔۔۔ "تم اس تصویر کو صاف کرا دو اور دیکھو اس کا کیا رنگ نکھرتا

ہے، میں مقابلہ کروں گا!"

اُمِ لیلیٰ نے کہا۔" تم کب تک اس کا پیچھا کرو گے اس کے دل میں شرارہ ہے۔ ہم نے اسے بچپن سے اپنی پرچھائیں میں لپیٹ کر رکھا ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک دست میں دیوار کے اس طرف کود گیا۔ یہ اصول ہے کہ آدمی جوان ہو تو خواہشیں سرکش ہو جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ سے دوسری سمت چلتا رہا۔ یاد ہے جب وہ چھوٹا تھا تو ہم اس کے کمرے سے سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے جمع کرتے تھے!"

انہوں نے کہا۔" مگر میں اسے روک لوں گا، شاید وہ میری بات مان لے!"

اُمِ لیلیٰ نے کہا۔" نہیں اب اس سے کوئی فائدہ نہیں، وقت ہمارے لئے دلدل بن چکا ہے، ہم زیادہ دیر اوپر نہیں رہ سکتے۔ وہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ اسے پکڑنا اب ہمارے لئے ممکن نہیں رہا، ہم بوڑھے ہو گئے ہیں!"

انہوں نے کہا۔" نہیں ابھی ہم بالکل مجبور نہیں ہوئے ہم اس تصویر کا ساتھ کیسے چھوڑ دیں!"

اُمِ لیلیٰ نے پوچھا۔" پھر تم کیا کرو گے؟"

میں شوکی سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں نے اس کا فیصلہ رد کر دیا ہے! اور ہاں اُمِ لیلیٰ ابھی تمہارا کام بھی ختم نہیں ہوا، تم ہمی کی فکر کرو، شوکی لڑکا تھا آزاد فضاؤں کے خواب دیکھنے والا، ہمی لڑکی ہے تمہاری بیٹی، اسے تمہاری مدد اور توجہ کی ضرورت ہے!

اُمِ لیلیٰ نے کہا۔" ہاں مجھے ہمی کا خیال ہے وہ آج کالج نہیں گئی، کالج کی طرف سے پکنک کا پروگرام تھا مگر میں نے اسے نہیں جانے دیا، وہ کمرے میں بیٹھی پڑھتی ہو گی یا تصویریں بناتی ہو گی!

انہوں نے کہا ــــ ناں اُمِ لیلیٰ ہنی کو پکنک پر نہ جانے دینا یہ مجھے پسند نہیں - اگر اس بار میری مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔

پھر کچھ دیر انہیں تیار ہونے میں لگی، تیار ہو کے وہ دفتر جانے کو نکلے ابھی وہ سیڑھیاں طے کر رہے تھے کہ باہر بس رکنے کی آواز آئی - پھر ہارن بجا - وہ جیسے ہی باہر نکلے انہوں نے ہنی کو بیرونی دروازے سے نکل کر تیزی سے باہر جاتے دیکھا۔

بیل باٹم، پونی ٹیل، گوگو گلاسز، تھرمس فلاسک، باٹنا کولر زادہ ٹھٹک کر رک گئے بس کی کھڑکیوں سے لڑکوں اور لڑکیوں کی مسرت آمیز چیخیں اُبھریں۔

"ہائے ہنی!"

"ہائے!"

"لکنگ سو کیوٹ!"

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز، خوشیوں سے بھرپور صحت مند قہقہے، پھر اچانک بس کے اندر سے ہپیوں اور بیٹلز کی چیختی چلاتی دھنوں کا سیلاب اُمڈا پھر کسی نے چیخ کر کہا ـــــ لٹ اس شیک!

"شیک، شیک، شیک!" اور بس شور مچاتی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی، انہوں نے پلٹ کر دیکھا اُمِ لیلیٰ باورچی خانے سے نکل رہی تھیں اور ان کا چہرہ پُرسکون تھا انہوں نے کہا "اُمِ لیلیٰ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا!" وہ باہر نکل آئے۔

اخبار اُن کے ہاتھ میں کسی سرکش پہاڑی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ ان کی نگاہیں اشتہاروں کے صفحے پر جمی ہوئی تھیں جہاں نمایاں جگہ پر ایک اعلان چھپا ہوا تھا۔ مشہور پاپ گروپ "دی بگز" شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا، ساتھ ہی ایک تصویر

چھپی تھی، لمبے بالوں والے لڑکے ہاتھوں میں گٹار لئے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں باغیانہ چمک تھی اوران کے کھنچے ہوئے ابرُو اور چہروں کے تیکھے نقوش یوں لگتے تھے جیسے ابھی بول اُٹھیں گے اوران کے جھرمٹ میں شوکی کھڑا تھا۔ بڑی شان سے گٹار تھامے مسکراتا ہوا۔ اس نے جنگ جیت لی تھی۔ شرافت مرزا نے شکست کے زبردست احساس کو اپنے اندر تڑپتے محسوس کیا۔ انہیں سخت پیاس محسوس ہوئی۔ سامنے میز پر گھنٹی رکھی تھی، انہوں نے گھنٹی بجائی، کوئی نہیں آیا۔ انہوں نے پھر گھنٹی بجائی پھر کوئی نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر لگاتار گھنٹی بجاتے رہے مگر چلمن کو حرکت نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے خود اُٹھ کر پانی پیا مگر پیاس کم نہ ہوئی۔ تھکاوٹ کے ایک اندرونی احساس کے تحت وہ لڑکھڑا کر اپنی کُرسی میں ڈھیر ہوگئے۔ سینے میں آگ تھی اور آنکھوں میں نمی! انہوں نے اخبار ایک طرف سرکایا تاکہ شوکی کی تصویر نظر کے سامنے سے ہٹ جائے۔ اسی وقت چپراسی جھٹک کر اندر آگیا۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بُلایا۔

"سُنو ——؟"

"جی ——؟"

یہ گھنٹی یہاں سے لے جاؤ!"

"مگر کیوں ——؟" چپراسی بھونچکا رہ گیا۔

"کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی!"

پھر انہوں نے شیروانی کے سب بٹن کھول دیئے، ایک لمبی سانس لی اور اپنے آپ سے کہا —— "میں نے تمہیں معاف کردیا، اُمِّ لیلیٰ واقعی ہم بہت بوڑھے ہوگئے ہیں۔"

❋

چور

صاحب کو پہلے حیرت ہوئی، پھر ہنسی آئی اس کے بعد بڑے زور کا غصہ آیا۔ بات ہی عجیب تھی۔ اب تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کسی کی میز سے کبھی ایک پن اِدھر سے اُدھر نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی کاغذ اپنی جگہ سے غائب نہیں پایا گیا لیکن آج بھری بزم میں اس وقت جب کہ صاحب کے کمرے میں دفتر کے تمام ذمے دار افراد موجود تھے اور حالات حاضرہ پر تبصرہ ہو رہا تھا، کسی نے پیچھے سے یہ راز کی بات کہہ دی کہ پچھلے کچھ دنوں سے دفتر میں اسٹیشنری کی چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں اور اب تک اسٹینو گرافروں کی الماریوں سے کئی دستے کاغذ اور کئی پیکیٹ کاربن پیپر غائب ہو چکا ہے۔ صاحب کے لئے یہ بات بہت عجیب تھی، انہیں حیرت ہوئی کہ دفتر میں چوری کا یہ پہلا واقعہ تھا پھر انہیں یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ چوری کرنے والے نے چوری کے لئے کیا چیز منتخب کی یعنی کاغذ کتنی معمولی سی چیز۔ مگر پھر انہیں اس بات پر غصہ بھی آیا کہ بحران کے اس دور میں یہی معمولی سی چیز اب اتنی اہم ہو گئی تھی کہ اس کے استعمال کو محدود کرنا پڑا تھا اور عملے کو سختی سے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ اسے احتیاط سے خرچ کیا جائے۔ صاحب کو غصہ آیا تو دفتر میں بھونچال آ گیا۔ در و دیوار لرز اٹھے اور دربان بھی اپنا اسٹول چھوڑ کے دور جا کھڑا ہوا اور دھوپ کھانے لگا۔

صاحب نے فوراً معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اعلیٰ تحقیقات کا حکم دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر کے تمام افسر سر جوڑ کے بیٹھے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسٹیشنری کو محفوظ درازوں

میں رکھا جائے اور ایسی تمام الماریاں جن میں کاغذ رکھا ہوا ہو مقفل کر دی جائیں لیکن اس حفاظتی انتظام کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ تیسرے ہی دن یہ حیرت ناک اطلاع آئی کہ بند درازوں اور مقفل الماریوں میں سے مزید کاغذ غائب ہو گیا ہے۔ صاحب کے حکم سے تحقیقاتی کمیشن کو فوری طور پر معطّل کر دیا گیا کیونکہ اس کی سفارشات بیکار محض ثابت ہوئی تھیں:

تحقیقاتی کمیشن کی ناکامی سے ان کا یہ عقیدہ اور راسخ ہو گیا کہ دفتر میں ان کے علاوہ سب نااہل ہیں۔ لہٰذا اب کی بار صاحب نے خود ہی معاملے کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔ سب سے پہلے انہوں نے دفتر کے ایسے تمام اہلکاروں کی ایک فہرست مرتب کی جو دوران تفتیش پوچھ گچھ کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ ان میں افسران، کلرک، اسٹینو گرافر لڑکیاں، دفتری، چپراسی، سب ہی شامل تھے لیکن ابھی وہ اپنی تحقیقات کا رُخ اور اس کا طریقۂ کار متعیّن کرنے کے لئے ذہنی کسرت میں مصروف تھے کہ میاں وفادار ان کی مشکل کشائی کے لئے آ پہنچے۔ یہ بے حد وضعدار آدمی تھے۔ صاحب پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ انہیں دفتر کے تمام حالات کی خبر رہتی تھی ہر افسر اور چپراسی کے معمولات کے بارے میں انہیں مکمل علم رہتا تھا۔ دفتر کے تمام رموز پر ان کی خوب نظر تھی اور وہ دفتر کے بیشتر لوگوں کے دفتری کاموں اور شخصی کارناموں سے اچھی طرح واقف تھے یہاں تک کہ وہ ان کی نہایت ذاتی دلچسپیوں پر بھی روشنی ڈالنے پر قادر تھے انہیں اس بات کا پورا پتہ تھا کون کون صاحبان وقت کی پابندی نہ کرنے کے پابند ہیں اور وہ کون چند خوش نصیب ہیں جو فَضۡلِ رَبِّیۡ کے باعث ہمیشہ دوسروں سے افضل نظر آتے ہیں اور جن کے سروں پر سونے کی چونچ اور چاندی کے پروں والا بابرکت پرندہ بیٹھنے میں انتہائی فخر محسوس کرتا ہے۔

میاں وفادار کو تو اس بات کا بھی علم تھا کہ کس افسر کی کارکردگی بڑھانے کے لئے اسے

کون سی اسٹینوگرافر کی تحویل میں دیا جائے اور کون سی ٹیلیفون آپریٹر سب سے زیادہ کس افسر کے ٹیلیفون نمبر کو مصروف رکھتی ہے۔ صاحب تو میاں وفادار کی ہمہ دانی کے اس حد تک قائل تھے کہ انہیں پیار سے دفتر کی "چغلخور انسائیکلوپیڈیا" کے نام سے پکارتے تھے۔ میاں وفادار سے صاحب کو یہ آسانی تھی کہ انہیں اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے دفتر کے تمام معاملات کا علم ہو جاتا۔ انہیں خود کچھ دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس وقت بھی جب کہ صاحب کاغذ کی چوری کی واردات کے بارے میں ذہنی قلابازیاں کھا رہے تھے میاں وفادار اچانک غیبی مدد بن کر نازل ہوئے۔ صاحب تو کھل اٹھے انہوں نے فوراً تازہ مسئلہ بیان کیا۔ میاں وفادار کے لئے یہ کون سا مشکل سوال تھا انہوں نے آنکھ بند کر کے ذرا سا معاملے پر غور کیا پھر دفتر کے مشتبہ افراد کی ایک فہرست مرتب کی جن کی نگہداشت سے معاملے کی تہہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔

صاحب نے ایک نظر اس فہرست کو دیکھا اس میں ہر عمر اور ہر درجے کے لوگ شامل تھے۔ کلرک۔ اسسٹنٹ۔ دفتری۔ چپراسی ہر نام کے آگے اس شخص کے چلنے اور عادات و اطوار پر مختصر تبصرہ درج تھا۔

—— الف، لمبوا اور بیوقوف، وہ خود کچھ نہیں کر سکتا۔ دوسروں کے حماقت آمیز مشوروں کا محتاج رہتا ہے۔

—— ب گنجا، موٹا اور پرلے درجے کا کاہل، دفتر میں صرف اونگھنے آتا ہے۔

—— ج کی آنکھوں سے کدورت ٹپکتی ہے۔ خطرناک آدمی ہے اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ دوسروں کی ناک توڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔

—— د کو دفتری کاموں سے دلچسپی نہیں۔

—— ر کا مختصر قد و قامت دیکھئے اور اس پر ان کا جہازی سائز کا بریف کیس۔ وہ تو خود

قانون شکنی کی ایک اعلیٰ مثال معلوم ہوتا ہے۔

—— ن، سست آدمی ہے مگر بہت چالاک اور سازشی۔ اس سے زیادہ کام چور تو شاید ہی کوئی ہو۔

—— ک، کاہل۔ بہت گھنّا آدمی ہے اس کی تہہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس کی پُر اسرار شخصیت کا پردہ چاک کرنے کی ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ۔

صاحب نے فہرست کو بغور دیکھا اور میاں وفادار سے پوچھا تمہارے خیال میں ان لوگوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے سے معاملے کی تہہ تک پہنچا جا سکتا ہے؟

میاں وفادار مسکرائے بولے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے حضور، میری تجربہ کار آنکھیں کبھی دھوکا نہیں کھاتیں!

صاحب نے ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے فہرست کو دیکھا اس میں صوفی کا نام بھی شامل تھا۔ صاحب کو قدرے حیرت ہوئی۔ صوفی حقیقتاً صوفی منش تھے۔ سنجیدہ، بُردبار اور پُر خلوص، دفتر میں جتنے بھی کلرک اور اسسٹنٹ تھے ان میں صاحب کو صوفی نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ ان کا خاموش تکلّم انہیں پسند تھا۔ ان کی سفید داڑھی۔ ان کی پیشانی پر سجدے کا نشان۔ ان کے ہونٹوں کی پُر سکون مسکراہٹ۔ ان کی آنکھوں کی مانوس چمک۔ سب معتبر تھی۔ جب بھی صوفی کوئی فائل لے کر کسی نکتے کی وضاحت کے لئے صاحب کے پاس آتے تو صاحب کو خوشی ہوتی۔ صوفی کی فرض شناسی بھی قابلِ داد تھی۔ اگر کوئی کام ان کے حوالے کیا جاتا

تو وہ اس وقت تک میز سے نہ اٹھتے جب تک کہ وہ کام مکمل نہ ہو جاتا۔ ان کا انہماک مثالی تھا۔ کام سے انہیں کوئی چیز باز نہ رکھ سکتی تھی۔ دفتر وقت سے آتے اور وقت سے جاتے۔ ان کا روزمرہ کا معمول آندھی، بارش یا طوفان سے کبھی متاثر نہ ہوتا۔ دفتر میں بھی وہ عموماً خود کو کام میں مصروف رکھتے اور سوائے نماز کے اوقات کے وہ کسی وقت قلم ہاتھ سے نہ رکھتے۔ نماز تو خیر وہ پابندی سے پڑھتے تھے لیکن کبھی کبھی خالی اوقات میں تسبیح پر وظائف پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ صوفی صاحب بڑے خوش الحان تھے۔ جب انہیں اپنے کام سے کچھ فراغت ہوتی تو وہ مدھم آواز میں اتنی خوش الحانی سے تلاوتِ قرآنِ پاک کرتے کہ سارا دفتر مسحور ہو جاتا۔ صوفی صاحب کی سب ہی عزّت کرتے تھے۔ صاحب نے اچنبھے سے کہا اس فہرست میں صوفی کا نام کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ تمہیں اس کی بزرگی اور رعب دار داڑھی متاثر نہیں کرتی؟

میاں وفادار ہنسے، بولے، بات یہ ہے کہ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سب فرشتوں میں نہیں آدمیوں میں رہتے ہیں تو پھر کسی کو معصوم قرار نہیں دیا جا سکتا اور ویسے بھی احتیاط کی خاطر کسی پر شبہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ذرا میرے ریمارک کو غور سے پڑھیے شاید بین السطور آپ کو حقیقت کی چمک نظر آئے!

صاحب نے دیکھا، لکھا تھا۔ صوفی خود اپنے بارے میں تلاش گمشدہ کا اشتہار ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو خود بخود یہ جی چاہتا ہے کہ ان پر شبہ کیا جائے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اصل شخصیت ان کے ظاہری روپ کے ناریل میں بند ہے۔ ان پر شک کرنا سب سے بڑی عقلمندی ہے۔

تفتیش کا پہلا مرحلہ خاموش نگرانی کا تھا جو خاصی خاموشی سے گزر گیا اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور حالات جوں کے توں رہے۔ آخر صاحب نے تنگ آ کر میاں وفادار کو ایک بار پھر طلب کیا اور کہا ـــــ بھئی خفیہ نگرانی تو بہت ہو چکی اب تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی عملی قدم اٹھایا جائے!

میاں وفادار نے حسبِ معمول چٹکی بجاتے ہی ایک تازہ تجویز رکھی، کیوں نہ دفتر سے جاتے وقت اسٹاف کی جامہ تلاشی لی جائے؟

صاحب کو یہ تجویز پسند آئی مگر انہوں نے کہا، اس کا اطلاق افسروں پر نہیں ہونا چاہیئے اس سے ان کی انا کو ٹھیس لگ سکتی ہے، خواتین کے پرس اور وینٹی بیگ کی تلاشی بھی فضول ہو گی کیونکہ کسی خاتون کے پرس کو ٹٹولنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے بیڈ روم میں جھانکے یہ قطعی شرمناک فعل ہے جس کی ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی غرض کہ کچھ دیر کی مفصل گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ دفتر میں صرف ایسے مشتبہ لوگوں کی تلاشی لے جائے گی جنہیں نہ کسی کو تلاشی دیتے ہوئے شرم آئے نہ جن کی تلاشی لیتے ہوئے کسی کو تکلف ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی انانیت سے بے نیاز اور راضی بہ رضا قوم محض وہی تھی جسے عرفِ عام میں چپراسی۔ چوکیدار۔ فراش۔ دفتری اور کلرک وغیرہ کہا جاتا ہے۔ خیر کچھ دن جامہ تلاشی بھی ہوتی رہی اور لوگوں کے تھیلوں۔ کھانے کے ڈبوں اور کپڑے کی پوٹلیوں میں مالِ مسروقہ کی تلاش جاری رہی مگر بے سُود۔ اسٹیشنری کی چوری کا معمہ اب بھی حل نہ ہو سکا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں نے تھیلے لانا چھوڑ دیئے اور اس کے بعد کھانے کے ڈبے لانے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا کیونکہ رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا تھا اور اس طرح دفتر میں تلاشی کی مہم کچھ سرد پڑ گئی۔

پھر ایک دن سہ پہر میں جب صاحب کام کے ہجوم سے پریشان بیٹھے تھے کہ اچانک

کوریڈور میں انہیں کچھ شور سا سنائی دیا۔ فوراً ہی بعد بہت سے تیز تیز قدموں کی آہٹیں ان کے دروازے تک آئیں پھر دروازہ کھلا۔ پردہ ہٹا اور دربان لپک کر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میاں وفادار آئے۔ ان کا چہرہ فرطِ جوش سے سُرخ ہو رہا تھا۔۔۔ بولے ۔۔۔ دربان نے آج ایک شکار پکڑا ہے۔ آپ کو حیرت تو ہوگی مگر مجھے پہلے سے یقین تھا صوفی کے پاس یقیناً کچھ ہے۔ شیروانی کی اندرونی جیب میں، مگر وہ تلاشی دینے پر آمادہ نہیں۔ دربان نے بہت کہا مگر وہ کہتا ہے کہ میں خود کو صرف صاحب کے سامنے تلاشی کے لئے پیش کروں گا۔

صاحب صوفی کا نام سُن کر مارے حیرت کے کھڑے ہو گئے۔ میاں وفادار کے عقب سے صوفی برآمد ہوئے۔ سر جھکائے ہوئے چہرہ افسردہ۔ ہونٹ خشک۔ داڑھی الجھی ہوئی۔ سجدے کا نشان دُھندلایا ہوا۔ بائیں ہاتھ سے سینے کو مضبُوطی سے تھامے ہوئے انہوں نے نظریں جھکا کے غمزدہ سی آواز میں کہا۔۔۔ "میں تلاشی دینے کو تیار ہوں مگر تخلیے میں!"

صاحب نے ایک نظر صوفی کو دیکھا اور پھر دربان اور میاں وفادار سے کہا۔۔۔ "آپ لوگ باہر جائیں"۔

جب وہ دونوں چلے گئے تو صوفی نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر صاحب کے قریب آئے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شیروانی کے بٹن کھولے، کیا بتاؤں صاحب، بہت شرمندہ ہوں۔۔۔ انہوں نے شیروانی کی اندرونی جیب سے ایک لمبا سا پیکٹ نکالا اور میز پر رکھ دیا۔۔۔ دو دن سے طبیعت خراب تھی، اختلاج کے باعث روزہ نہیں رکھ سکا۔ چلتے وقت بیوی نے زبردستی یہ پیکٹ ساتھ کر دیا تھا مگر دفتر میں اسے کھولنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ کہتے ہوئے صوفی نے پیکٹ کھولا۔ اندر دو چپاتیاں تہہ کی ہوئی رکھی تھیں!

❖

تہہ خانہ

اس قافلے میں کل دس آدمی تھے جن میں دو جوڑے تھے اور باقی چھ اکہرے جنہیں عرفِ عام میں کنوارا کہا جاتا ہے۔ دونوں جوڑوں میں سے ایک جوڑا امریکی تھا اور دوسرا فرانسیسی! ایک صاحب برطانوی سامراج کے ڈوبتے ہوئے سورج کا پیام لائے تھے۔ یہ یارک شائر کے ایک نہایت ہی معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کا نامِ نامی، اسمِ گرامی تھا میکالے، دوسرے صاحب آئرلینڈ کے فلسفی تھے رسل تیسرے صاحب ایک ہسپانوی نژاد مصور آلبرتو تھے جو دن میں تصویریں بناتے اور رات میں گٹار بجاتے، چوتھا ایک نیگرو تھا جو وسطِ کانگو کا ایک صحافی تھا، اس کا نام تھا بم بوبانا، پانچواں شخص ایک فلسطینی عرب سیاح الحاج محمد عبدالکریم المصطفےٰ فخرے تھا جو اپنے پرس میں یاسر عرفات اور ایک مصری رقاصہ کی تصویریں لگائے رکھتا اور رات کو کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر پہلے عرفات کی تصویر دیکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگاتا، اسرائیل کو کوستا، استعماری قوتوں کو گالیاں دیتا اور پھر رقاصہ کے آتشیں زاویوں پر انگلی پھیر کر نہایت سرد و گرم آہیں بھرتا۔ چھٹا شخص محکمہ سیاحت کا ایک افسر تھا شکیل، جو اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

یہ سب لوگ ایک ٹورسٹ کوچ کے ذریعے اس دُور دراز مقام تک پہنچے تھے۔ اس سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں یہاں آنا کوئی آسان بات نہیں تھی لیکن آثارِ قدیمہ کی سیاحت

اور تاریخی مقامات کی زیارت کا شوق انہیں اس موسم میں بھی یہاں تک کشاں کشاں لے آیا تھا۔
امریکی بوڑھے مسٹر اور مسز گولڈ واٹر کا مارے گرمی کے بُرا حال تھا۔ ان کے چہرے سُرخ بھبھوکا
ہو رہے تھے اور سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ فرانسیسی جوڑا بھی بہت بے چین نظر آتا تھا
اور انہیں بے چین دیکھ کر شیکل صاحب کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دوسرے
لوگ گرمی کے باوجود اپنی سرگرمی سے مطمئن نظر آتے تھے۔ نیگرو صحافی موبماٹا بار بار اپنی ڈائری
پر جھک کر کچھ نوٹ کرتا اور اپنے مووی کیمرے کو کام میں لاتا۔ مسٹر میکالے تمام راستے اپنے اسلاف
کے کارناموں، جاہ و جلال اور سطوت کا تذکرہ کرتے چلے آئے تھے۔ ان کے دادا اور پردادا
اور ان کے چچا جو مختلف ادوار میں برطانوی دارالامراء کے رکن رہ چکے تھے، لمبی چوڑی کہانیوں
کا عنوان بنے ہوئے تھے۔ ہسپانوی مصور آکبر تو سارے سفر میں اپنی تصویروں کے موضوعات،
ان کی علامتی پیش کش اور رنگوں کے امتزاج پر تبصرہ کرتا آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے گٹار
کے بکس پر ہاتھ پھیرتا اور اپنی بڑی بہن ریناتے کی موسیقاری کی شہرت پر رشک کرتا۔ فلسفی
رسل سفر کا سارا مرحلہ ایک موٹے سگار کے سہارے طے کر گئے۔ انہیں سگار اس لئے پسند
تھا کہ سگار نوشی صبر و تحمل کی علامت ہے۔ وہ بلند حوصلگی اور ثابت قدمی پر یقین رکھتے
تھے لہٰذا ان کے نزدیک سگار نوشی سے آدمی کی متانت اور بُردباری کا اظہار ہوتا تھا۔
رسل کے منہ میں سگار ہوتا تو لوگ سمجھتے کہ انہیں یقیناً انسانی نفسیات کا کوئی پیچیدہ مسئلہ درپیش
ہے اور جوں جوں سگار چھوٹا ہوتا جاتا اور راکھ کے پھول ہوائیں بکھرتے جاتے، لوگ سمجھتے کہ رسل
کی منزل قریب ہے اور انہیں اپنے سوالوں کا جواب مل گیا ہے۔ فلسطینی عرب سیاح الحاج
محمد عبدالکریم المصطفےٰ فخر سے بغداد کے قہوہ خانوں کے گیت گاتا چلا آیا تھا، اسے رہ رہ کر
قاہرہ کی شامیں یاد آ رہی تھیں۔ ایک مرتبہ موبماٹا نے اس کی بھونڈی آواز اور بے سُرے گیتوں

سے اکتا کر پوچھا۔

"تم یقیناً کوئی گویئے معلوم ہوتے ہو، ہفتے میں کتنے پونڈ کما لیتے ہو۔۔۔؟"

فخری اس طرزِ تخاطب پر بہت خفا ہوا کہنے لگا۔۔۔۔

ہماری سات پشتوں میں کبھی کوئی گویا نہیں رہا، ہم اہلِ سیف ہیں، ہمارے قبیلے کے لوگ ایک ہی گیت گانا جانتے ہیں اور وہ ہیں تلواروں کے گیت، جدید عرب دُنیا کی تعمیر میں ہمارے اسلاف کا خُون شامل ہے ویسے پیشے کے اعتبار سے ہمارے خاندان کے لوگ مفتی اور قاضی ہیں، ہم حق و انصاف کے سپاہی ہیں شیخ!"

الحاج عبدالکریم فخری کو اپنے عرب ہونے پر بہت ناز تھا، اسے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس کی رگوں میں عرب جنگجوؤں کا خون دوڑ رہا تھا وہ بھلا اپنا گویا ہونا کیسے برداشت کر لیتا۔ وہ مُنہ پھُلا کے بیٹھ گیا اور بہت دیر تک راستے میں کوئی بحث و مباحثہ نہ ہوا۔ لوگ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلتے لیکن کوئی بات شروع نہ ہوتی۔ خاموشی کی گرہ کسی سے نہ کھلی کوئی اور موقعہ ہوتا تو صنفِ نازک کی موجودگی یقیناً سب کے لئے باعث رحمت ہوتی اور اس طرح سفر کی اُلجھن بھی بڑی حد تک کم ہو جاتی لیکن دو، دو خواتین کی موجودگی میں بھی یہ سناٹا طویل تر ہوتا گیا کیونکہ بد قسمتی سے دونوں بیبیاں ریزرو نشستوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور مسٹر گولڈ واٹر اور موسیو ژاں روسیلاں اپنی بیگمات کو یوں پرں میں سمیٹے بیٹھے تھے کہ کسی کو ادھر دیکھنے کی بھی تاب نہ تھی۔

لنچ کا انتظام ریسٹ ہاؤس میں تھا۔ لنچ کے بعد شام تک قیلولہ کیا گیا پھر شکیل صاحب کی رہنمائی میں یہ قافلہ آثارِ قدیمہ کی زیارت کو نکلا۔ سب سے پہلے میوزیم دیکھا گیا۔ کھدائی میں برآمد ہونے والی قدیم تہذیب کے آثار کی نمائش سب کے لئے بڑی دلچسپی کا مرکز تھی،

پتھر کی مورتیاں، مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ٹکڑے، خوبصورت تصویریں، مہریں، کسی انوکھی زبان میں لکھے ہوئے کتبے، پتھر کے زیورات، لکڑی کے ہتھیار، گڑیاں، کھلونے، پانچ ہزار سال پرانی گندم، ہر چیز منظر کے سامنے تھی۔ نیسگر و صحافی موتباٹا بڑے انہماک سے ان تمام چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کی ڈائری کے صفحات سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ کیمرے کی آنکھ بار بار جھپک رہی تھی۔ میوزیم کا منتظم اور محکمہ سیاحت کے افسر رابطہ شکیل صاحب سیاحوں کو مختلف چیزوں کے بارے میں نت نئے انکشافات سے حیران کر دینے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

"اچھا آپ نے دیکھا ــــ؟" گائیڈ نے ایک سوکھے ہوئے جوتے کی طرف اشارہ کیا، "پانچ سو سال پرانا جوتا۔"

"اچھا، خوب! ــــ" فخورے بولا۔ "یہ جوتا ہے؟"

موتباٹا نے کہا ــــ "جی جناب اور صرف پانچ سو سال پرانا۔"

"کوئی بات نہیں ــــ!" فخورے نے کہا ــــ "ویسے میں اسے کچھ اور سمجھا تھا۔"

"کچھ اور کیا ــــ؟" گائیڈ نے پوچھا۔

"یعنی کوئی اور چیز۔" فخورے نے جواب دیا۔

"یعنی کیا چیز؟" موتباٹا فخورے کے سر ہو گیا۔

"یعنی، یہ کہ ..... یعنی ..... فخورے کچھ سوچ کر بولا ..... "خلائی کشتی!"

وہ سنبھل کر بولا ــــ "ہاں بالکل ٹھیک میں اسے کوئی قدیم فرعونی کشتی سمجھا تھا!"

"یہ خوب، شکیل صاحب چہکے کشتی کیسی؟ بھلا اتنی چھوٹی کشتی ؟؟"

فخورے نے اطمینان سے کہا ــــ "گردش زمانہ سے کشتی کا سکڑ جانا قرین قیاس نہیں

ہے کیا ؟"

ہسپانوی مصوّر آلبرتو نے ایک پوڑی پر کھڑے ہوئے انوکھے منظر کو غور سے دیکھا اور مُڑ کے بولا۔

"آپ لوگوں نے کچھ سُنا اس میں موسیقی ہے، مجھے کیٹس یاد آ رہا ہے" اس تصویر میں آواز ہے حُسن، صداقت ہے اور صداقت حسن، ذرا غور سے سنئے، سمفنی سمفنی ــــ"

میوزیم سے یہ قافلہ بوڑھے گائیڈ کی رہنمائی میں، کھدائی میں برآمد ہونے والا شہر دیکھنے روانہ ہوا۔ گائیڈ جس کی بوڑھی ملگجی داڑھی میں تجربات کی دھوپ، چھاؤں جذب تھی، بہت باتونی تھا۔ وہ مٹی کے ہر ڈھیر اور ہر اکھڑی ہوئی اینٹ اور ہر گڑھے کے تعلق سے کوئی طویل سی داستان سُنا دیتا۔ نیگرو صحافی اس کی باتوں میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ عرب سیاح مٹی سے اٹے ہوئے راستوں پہ چلتے چلتے اُکتا گیا تھا۔ مسٹر میکالے بار بار اپنی کیپ ٹھیک کر رہے تھے۔ رسّل کا سگار بڑی تیزی سے ختم ہو رہا تھا اور وہ کھڑے ہوئے شہر کی پختہ گلیوں سے گذرتے ہوئے قدیم تہذیب کی فضیلت کے قائل ہوتے جا رہے تھے۔

مسٹر گولڈ واٹر اور موسیو رومیلاں اپنی بیگمات کے ساتھ بڑی بیدلی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ مادام رومیلاں کو اپنے رخساروں کے غازے کی فکر تھی جو پسینے سے بہا جا رہا تھا اور مسز گولڈ واٹر کو افریقی نیگرو کی قربت سے وحشت ہو رہی تھی۔ ایک صاف اور پختہ گلی سے گذرتے ہوئے فلسفی رسّل نے کہا۔

"اب یہ بات مسلّمہ ہے کہ پانچ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب ہماری تہذیب سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ شہر کی پلاننگ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ کتنے دُور اندیش، خوش فکر اور مہذب ہوں گے !"

مسٹر گولڈواٹر کو یہ بات کچھ زیادہ پسند نہیں آئی، انہوں نے جھک کر اپنی بیگم سے طنزیہ انداز میں کہا۔

"یہ آئرلینڈ کا کھوسٹ فلسفی خود کو نجانے کیا سمجھتا ہے؟"

ایک کنوئیں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر کے پاس سب لوگ ٹھہر گئے۔ رسل نے افسردگی سے کہا۔

"کبھی اس کنوئیں سے ایک زمانہ سیراب ہوتا ہوگا؟"

قافلہ ذرا دیر کو ٹھہرا تو مادام رد میلاں نے پرس سے آئینہ برآمد کیا اور حسن برہم کو درست کرنے لگیں۔ مسٹر گولڈواٹر نے سگریٹ سلگایا اور اپنی بیگم کو پیار سے دیکھا جو نیگرو صحافی سے ہٹ کر اس طرح سمٹی کھڑی تھیں جیسے کوئی پرنالے کی زد سے بچتا ہے۔ بوڑھا گائیڈ منہدم دیواروں کی طرف اشارہ کر کے پارینہ یادیں دہرا رہا تھا۔ نیگرو صحافی نے جیب سے سگریٹوں کا ٹن نکالا اور ہسپانوی مصور البرتو کو پیش کیا، "سینور سگریٹ پیجئے! موسیو رد میلاں آپ بھی سگریٹ لیں ——!" سگریٹ لبوں میں دبا کر البرتو نے لائیٹر جلایا اور سنہرے شعلے کو دائرے میں نچا کے بولا۔

"انسانی تمدن کی ترقی کے نام ——!"

رسل نے سگار کے کونے کو دانتوں سے کترا، "تمدن کی ترقی، ہونہہ یہ کھنڈر تو ہماری تہذیب کا مرثیہ ہیں، تم نے نہیں سنا ——؟" اس نے زہر خند سے کہا۔

عرب سیاح نے کہا —— "یہ لوگ بڑے امن پسند تھے ——!"

رسل نے کہا —— "غلط —— انسان کبھی بھی امن پسند نہیں رہا ——"

نیگرو صحافی بہت زور سے ہنسا۔ امریکی جوڑے نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

مسٹر گولڈ واٹر نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ کمینہ فلسفی..... !"

مسز گولڈ واٹر کسمسا کر نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولیں۔

"اور یہ کمبخت نیگرو! اس کی ہنسی کیسی وحشتناک ہے، منحوس!"

افریقی نیگرو نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور ایسے مسکرایا جیسے وہ اس کے باوجود اپنے آپ سے مطمئن ہو۔

بوڑھے گائیڈ نے کہا۔ "گوتم بدھ کا مجسمہ دیکھیں گے آپ لوگ؟"

"ضرور ضرور ——" سیاح بے چین ہو گئے۔

ایک وسیع چبوترے پر شہزادہ سدھارتھ آلتی پالتی مارے تشریف فرما تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں اور چہرے پر ناقابلِ بیان طمانیت تھی، ہونٹوں پر امن کے گیت منجمد تھے، کانوں کی پھیلی ہوئی لوؤں میں طہارت کی روشنی تھی اور سر کے گرد نور کا ہالا قائم تھا۔ یہ سارے لوگ اس چبوترے کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ گوتم انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

رسل نے کہا —— "گوتم تمہاری جستجو بیسود ہے! ہم وہ نہیں جن کی تمہیں تلاش ہے!"

رات ہوئی تو سب لوگ ریسٹ ہاؤس واپس لوٹ آئے۔ رات کے کھانے کے بعد آلبرتو برآمدے میں ٹانگیں پسار کے بیٹھ گیا اور گٹار بجانے لگا۔ عرب سیاح ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر مصری پریزاد کا رقص دیکھتا رہا۔ مسٹر میکالے وضعدار آدمی تھے وہ جلد ہی سب کو شب بخیر کہہ کر برطانوی پارلیمنٹ کے اجلاس میں شریک ہونے چلے گئے۔ نیگرو صحافی مومباٹا برآمدے کے ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر افریشیائی اتحاد اور افریقی عوام کی

بیداری کے گیت گا تا رہا۔ فلسفی رسل نے ساری رات سگار کے سہارے گزارنے کا عہد کیا اور چاندنی کے ورق پر آثار قدیمہ کی داستان پڑھنے کے شوق میں انہوں نے نیند سے رابطہ توڑ کر سگار سے واسطہ جوڑ لیا۔ شکیل صاحب امریکی جوڑے سے حتی المقدور بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور فرانسیسی جوڑا ریسٹ ہاؤس کے تاریک گوشے سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا۔ موسیو رد میلاں، مادام رد میلاں پر جھکے ہوئے اندھیرے میں ہونٹوں کے یاقوت پرکھ رہے تھے۔

دوسری صبح یہ قافلہ بوڑھے گائیڈ کی رہنمائی میں یہاں سے کچھ دور مغلیہ دور کے ایک قدیم کھنڈر تک پہنچا۔ یہاں کچھ شکستہ مقبرے تھے اور مغلیہ دور کی ایک مسجد اب بھی موجود تھی۔

"یہ ہمارے اسلاف کی یادگار ہے ۔۔۔۔!" شکیل صاحب نے فخر سے کہا۔

سارے کھنڈرات کو گھوم پھر کر دیکھا گیا۔ مسجد قدیم فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی اس کی دیواروں میں اینٹوں کی جُڑائی اور گنبد پر نقش و نگار قابلِ دید تھے۔ افریقی نیگرو ہر پتھر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ عرب سیاح مسجد کی خوبصورتی دیکھ کر مرحبا، مرحبا پکار اٹھا۔ امریکی جوڑے نے فرانسیسی جوڑے کے ساتھ کھڑے ہو کر مسجد کے صحن میں تصویر کھنچوائی۔ مسٹر میکالے نے آلبرتو کو مشورہ دیا کہ وہ اس منظر کو اپنے ذہن میں محفوظ کرے تاکہ اسے آسانی کے ساتھ کینوس پر منتقل کر سکے۔ مسجد سے نکل کر قریبی مقبروں کو دیکھا گیا۔ مقبروں کے نیلے پتھر، اونچی محرابیں، بلند گنبد، ہر چیز ان کے لئے پُرکشش تھی۔ انہوں نے شکستہ قبروں کے سامنے کھڑے ہو کر کتبے پڑھنے کی کوشش کی۔ خواتین نے گنبد کے نیچے کھڑے ہو کر زور زور سے ایک دوسرے کو پکارا اور آوازوں کی گونج اپنی روح میں اُترتی محسوس کی۔

اسی وقت بوڑھے گائیڈ نے اس سُرنگ کا تذکرہ کیا جو ایک مقبرے کے نیچے واقع تھی۔ یکلخت سب لوگ اس سُرنگ کو دیکھنے کے لئے تڑپ اٹھے۔ نیگرو صحافی آگے آگے تھا۔ امریکی اور فرانسیسی جوڑوں کو بھی سُرنگ دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ عرب سیّاح اور ہسپانوی مصوّر بھی اس سُرنگ کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ذرا دیر کھنڈروں کے پُرپیچ راستوں اور مقبروں کی راہداریوں سے گزرنے کے بعد بوڑھے گائیڈ کی قیادت میں یہ قافلہ ایک شکستہ حال مزار کے سامنے پہنچا۔ اس مزار کے نیچے سُرنگ واقع تھی۔ بوڑھا گائیڈ مقبرے کی نچلی منزل میں داخل ہو کر ایک اندھیری کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔ اندر سخت گھٹن تھی۔ سیّاح کوٹھڑی میں داخل ہوئے تو کچھ سیڑھیاں ملیں۔ سیڑھیوں پر سخت اندھیرا تھا اور پھسلن بہت تھی بڑی احتیاط سے قدم جما جما کر اُترنا پڑا۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو سیلی ہَوا کا ایک جھونکا ان کے چہروں سے آ ٹکرایا۔ اس تہ خانہ کے آخر میں سُرنگ کا دہانہ تھا جس پر مکڑی کا جالا تنا ہوا تھا۔ بوڑھے گائیڈ نے بتایا کہ یہ سُرنگ اس مقبرے کے نیچے ایک زمانے سے موجود تھی اور اس کا دوسرا دہانہ مقبرے کی پُشت پر کھارے پانی کے ایک چشمے کے کنارے واقع تھا۔ عرب سیّاح الحاج عبدالکریم المصطفےٰ نخوزے نے تاریکی کی کہُر کو ناپید کرنے کے لئے دیا سلائی روشن کی۔ دیا سلائی کا شعلہ تاریک فضا میں انگڑائی لے کر اُٹھا اور چاروں طرف مدہم سا اُجالا پھیل گیا۔ سُرنگ اندر سے تاریک تھی اور دُور تک چلی گئی تھی اس کی چوڑائی زیادہ سے زیادہ چار فٹ ہو گی اس میں سے گزرنے کے لئے آدمی کو گھٹنوں کے بل چلنا پڑتا۔

مسٹر میکالے نے تیوری چڑھا کے کہا — "یہاں کس قدر سفوکیشن ہے —؟"

یکایک آلبرتو کی مہم جُو رُوح کو جوش آ گیا، اس نے سُرنگ میں جھانکا اور پکار

کر کہا ———

"کیوں صاحبان اندر چلیں ——— ؟"

نیگرو صحافی نے پتلون کی موریاں چڑھالیں اور ہاتھ اٹھا کے بولا ——— "میں تیار ہوں ——— !"

مسٹر گولڈ واٹر اور موسیو رو میلاں بھی سُرنگ کو اندر سے دیکھنا چاہتے تھے۔ بوڑھا گائیڈ ان کے ارادے کو بھانپ گیا اور کھنکھار کے بولا ——— "کیا آپ واقعی اندر جانا چاہتے ہیں ؟ مگر ٹھہریئے اس سُرنگ کے بارے میں سب سے عجیب بات تو میں نے ابھی آپ کو بتائی ہی نہیں، یہ سُرنگ زیادہ لمبی نہیں، اسے پار کرنا مشکل ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ مقبرے والے بزرگ کی دُعا سے اس سُرنگ سے صرف وہی شخص گزر سکتا ہے جس کے نطفے میں فرق نہ ہو ایسا شخص جس کے خون میں ملاوٹ ہو گی اسے ہرگز پار نہیں کر سکتا، بیشمار لوگ اس کے اندر ہی مر کھپ گئے اور دوسرے سرے تک نہ پہنچ سکے !"

مسٹر میکالے نے ہڑبڑا کر کہا ——— "بکواس ——— !" اور زور کا قہقہہ لگایا لیکن لوگ ان کے قہقہے کے کھوکھلے پن کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے، عرب سیاح کے ہاتھ میں دیا سلائی بجھ گئی اور ہر طرف ناقابلِ بیان تاریکی چھا گئی۔ خواتین نے چیخ ماری اور مسز گولڈ واٹر ہم کر اندھیرے میں افریقی نیگرو موبانا سے لپٹ گئیں۔ اکبر تو سُرنگ کے دہانے سے پیچھے سرک آیا۔ ماحول بالکل منجمد ہو گیا تھا۔ تہ خانہ میں سیلن کی بو اور بڑھ گئی سب نے خود کو حنوط کردہ لاشوں میں تبدیل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ اسی وقت مادام رومیلاں کو سخت پیاس لگی۔ موسیو رومیلاں، مادام رومیلاں کو ساتھ لے کر میکالے صاحب کے ہمراہ تہ خانے سے باہر نکل آئے۔ مسز گولڈ واٹر نے مسٹر گولڈ واٹر سے کہا ——— "میں مسجد کے

صحن میں جانا چاہتی ہوں وہاں کھلی ہوا ہے!"

آلبرتو نے کہا ــــ "میں مقبرے کے گنبد کو دیکھنا چاہتا ہوں ــــ!"

مسٹر میکائے کو اور شدت سے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد تہہ خانے کی تاریکی میں بوڑھے گائیڈ کی آواز ایک بار پھر ابھری ــــ "آپ میں سے کون کون اندر جانا چاہتا ہے؟"

جواب میں نیگرو صحافی موتیاناٹا کا ہلکا سا قہقہہ گونجا، اس نے کہا ــــ

"بس رہنے دو، کھیل ختم ہو گیا ــــ!" پھر اس نے اندھیرے میں فلسفی رسل کو ٹٹول کر کہا ــــ "سب چلے گئے آپ نے دیکھا کوئی ننگا ہونا پسند نہیں کرتا؟"

رسل نے کہا ــــ "اور مجھے آج پتہ چلا کہ تہہ خانہ تو خود ہمارے اندر ہے، مگر یہ سب کیا تھا کوئی تمہارے ذہن کی اختراع ہے؟"

موتیاناٹا نے شرارت بھرے لہجے میں کہا ــــ "میں نے اس کہانی کی قیمت صرف پانچ روپے ادا کی!"

رسل مسکرایا ــــ "افسوس تم نے ہمیں ننگا دیکھنے کی کتنی کم قیمت لگائی!"

تہہ خانے کی تاریکی میں سگار کی آنکھ روشن تھی اور راکھ کے پھول بکھر رہے تھے۔

تعبیر

ہے دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

بے تصویر چوکھٹا

عجیب منظر ہے۔

ہر شخص کے ہاتھ میں کارڈ ہے۔ جس پر لکیریں اور نقطے ہیں۔

اور سرے پر ایک شخص ہے جو پکارتا ہے

لوگوں کا اژدحام ہے، ایک خلقت جمع ہے، مرد اور عورتیں، بوڑھے اور جوان۔

بڑی گہما گہمی ہے۔

لوگ اپنے کارڈوں پر جھکے ہوئے ہیں اور آواز لگ رہی ہے۔

وہ سوچتا ہے تو کیا آخری آواز تک ہر شخص کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں رہے گا، کچھ پتہ نہیں۔

نامۂ اعمال، وہ کارڈ اُلٹ پلٹ کے دیکھتا ہے، کیا سچ مچ یہ میرا نامۂ اعمال ہے اور جو کچھ میں نے کیا اور جو میں نے کرنے کا ارادہ کیا اس کا عکس اس میں ہے؟ وہ ایک بار پھر کارڈ پر نظر دوڑاتا ہے، یہ کیا لکھا ہوا ہے، ایک یا شاید الف، اس کے نام کا پہلا حرف ــــ الف سے اللہ اور الف سے آدمی اور الف سے الفت اور الف سے آخرت ــــ الف کی سرحدیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

الف پر اسے اپنا باپ یاد آتا ہے۔ اس کا نام ہی الف دین تھا، کیسا یدھا سادھا

شریف آدمی تھا لیکن دُنیا میں حاضری لگانے آیا تھا باقی تو اسے کچھ ملا نہیں، ساری زندگی
چودھریوں کی جوتیاں سیدھی کرتا رہا بس اس کے دل میں ایک ہی تمنّا تھی کہ اس کا بیٹا کوئی
تیس مار خان بن جائے۔ ایک اس کی ماں تھی، بیچاری دیوانی وہ اس کے لئے جان دے
دیتی تھی بلکہ اس نے اپنی ساری شخصیت، ساری خوبصورتی، ساری نرمی، ساری محبت بلکہ
ساری زندگی دونوں ہاتھوں سے لٹادی، اس کے اوپر سے نچھاور کردی۔ الف پر اسے پہلے
اپنا اسکول اور پھر مولوی ایمان علی صاحب یاد آئے جو کہتے تھے، بیٹا ہمیشہ سچ بولا کرو اور
سچے لوگوں کی صحبت میں رہا کرو اس سے اچھی بات کوئی نہیں۔ اس سے ایمان درست
رہتا ہے اور آدمی گناہ کی طرف راغب نہیں ہوتا ـــــ!

گناہ کیا ہوتا ہے مولوی صاحب؟ وہ معصومیت سے سوال کرتا

اور مولوی صاحب کہتے ـــــ گناہ وہ کام ہے جس سے اللہ ناخوش ہوتا ہے!

اُس نے سوچا، مولوی صاحب بھی کیسے بھولے تھے حالانکہ بعد میں تجربے سے ثابت
ہوا کہ گناہ نہ کرنے سے اللہ ناراض ہوتا ہے، اللہ تو مہربان ہے معاف کرنے والا ہے!

نیلوفر بھی یہی کہتی تھی، اس کی بیوی، اس کی تصویروں کی طرح خوبصورت، اس کے
رنگوں کی طرح دلفریب اور اس کے مُوقلم سے کھنچے ہوئے خط کی طرح تیکھی اور سحر انگیز!

وہ کہتی ـــــ تم گناہ کی بات کرتے ہو؟ گناہ کیا ہے تمہیں کیا پتہ؟ یہ کوئی ایسی چیز نہیں
ہے جو انسان پر باہر سے تھوپ دی گئی ہے، جناب من گناہ تو نہایت انسانی جذبہ ہے جو
جتنا انسان ہے اتنا ہی گنہگار ہے اور یہی سچ ہے!

کیا مطلب؟ اس کے اندر چھپے ہوئے مولوی ایمان علی کو جھرجھری آجاتی، لیکن جب
کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ معصوم ہوتا ہے، گناہوں سے بالکل پاک!

نیلوفر ہنستی ـــــ میرے بھولے بادشاہ یہ محض کتابی باتیں ہیں، انسان تو گناہوں کی سواری ہے ایسا نہ ہوتا تو وہ بھلا جنت سے کیوں نکالا جاتا، ہر بچہ اپنے ہاتھ میں گناہوں کا محضر نامہ لے کر پیدا ہوتا ہے، ایسی غیر مرئی دستاویز جس میں اس کے سب گناہ لکھے ہوتے ہیں اور وہ ساری زندگی ان گناہوں کو اپنے کھاتے سے مٹانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا آخری بلاوا آجاتا ہے اور اس کے اعمال نامے میں یہ تحریر باقی رہ جاتی ہے کہ وہ آدمی سے فرشتہ بننے کے سفر میں کتنی منزلیں طے کر چکا ہے ـــــ اور سنو جب حساب ہو گا تو صرف اسے اجر ملے گا جس کے ہاتھ میں گناہوں کی سلیٹ بالکل صاف ہے، یہ بھی ایک قسم کی ہاؤزی ہے۔ مجھے پتہ ہے زیادہ تر لوگ فرشتہ بننا چاہتے ہیں اور حشر کے دن، اسنوبال جیتنا چاہتے ہیں لیکن میں ان میں سے ہوں جو اپنے انسان ہونے سے مطمئن ہیں ـــــ مجھے جان تو گناہوں سے مت ڈرو، گناہ اصل ہے اور بدی اتنا فطری جذبہ ہے کہ ہر نیکی غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔

کبھی کبھی لسے اپنی بیوی کی باتیں اس قدر شیطانی لگتیں کہ اسے جھرجھری سی آجاتی لیکن اس کی خوبصورتی اس کی باتوں سے زیادہ گمراہ کن تھی۔

اچانک برابر والا بے صبرا اسے دھکا دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے، کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما ہے اور پکارنے والا پکارتا ہے اور لوگ اپنے کارڈوں پر جھکے ہوئے ہیں وہ اپنا کارڈ دیکھتا ہے، عام قسم کا کارڈ ہے، اس کا رنگ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، شاید اس کا کوئی رنگ نہیں، شاید رنگ باقی نہیں رہے یا پھر اس کی رنگوں کی تمیز ہی جاتی رہی۔ پروردگار تیرا شکر ہے، وہ سوچتا ہے، سب رنگ دھوکہ دیتے ہیں، رنگ جھوٹ بولتے ہیں، وہ قالب بدلتے ہیں، وہ انہیں خوب سمجھتا تھا۔ انہیں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا، پرکھ کے،

چھو کے، چوم کے! درختوں کی ہریالی، آسمان کی نیلاہٹ، دریا کا مٹیالا پن، آنکھوں کے نیلم اور ہونٹوں کے گلاب! اس کی تصویروں میں رنگوں کی ایسی دنیا آباد تھی جنہیں وہ سوتے جاگتے چھو سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے تصویر کے منظر میں وہ خود بکھرا ہوا ہے، اور زمین اور آسمان کے درمیان معلق وسعتوں پر اس کے وجود کی دھنک رنگ برنگی رتی کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ پھر ایک شام جب وہ نگار خانے میں اپنی تصویروں کی نمائش کے بعد کھڑکی کے پاس کھڑا ڈوبتے سورج کے نارنجی رنگوں کو اپنی روح میں اترتے دیکھ رہا تھا کسی نے اُسے پکارا۔ یہ نیلوفر تھی، اسے یوں لگا جیسے سورج نے غروب ہونے کا ارادہ ملتوی کر کے اچانک اس کے نگار خانے میں جست لگادی ہو۔ وہ بولی ــــ میں آپ کو قریب سے دیکھنے کی آرزومند تھی، آپ کا نام میرے لئے مقدس بن گیا تھا، میں آپ کی تصویروں سے بہت متاثر ہوں۔

اس نے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ نیلوفر کی آنکھوں میں جو رنگ تھے وہ اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ نیلوفر سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ نیلوفر سے اس کی دوسری ملاقات سمندر کے کنارے ہوئی۔ وہ سمندر کی جھاگ اُگلتی سرکش موجوں کو رنگوں کے پنجرے میں قید کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ آ پہنچی ــــ اچھا تو آپ یہاں بیٹھے ہیں، اتنی تنہائی میں، شاید تخلیق کے لئے تنہائی لازمی ہو، مجھے تو پتہ نہیں مگر آپ شاید اکیلے میں دُنیا کے رنگوں کو زیادہ توجہ سے سمیٹ سکتے ہیں کیوں؟

وہ مسکرا کے بولا ــــ بات یہ ہے کہ میری تصویریں اور میرے سب رنگ تتلیاں ہیں جو میرے اندر موجود ہیں اور میں اپنے اندر کی دُنیا سمیٹ رہا ہوں، شاید اسی لئے اپنے میں ڈوب جانا ضروری ہے!

نیلوفر مسکرائی تو اس کے ہونٹوں پر تتلی پھڑپھڑانے لگی اور وہ حیران رہ گیا۔ نیلوفر سے تیسری ملاقات کہاں ہوئی اسے یاد نہ تھا البتہ یہ بات ابتک اس کے ذہن میں تازہ تھی کہ اس دن وہ اس کی ایک تصویر دیکھ کے بولی، کمال ہے اس تصویر میں آپ نے جو رنگ استعمال کئے ہیں وہ تو ایسے ہیں جو میں نے پہلی بار دیکھے ہیں، سیپ سے نکلتا ہوا پودا اور اس کے شگوفوں کی جھلملاہٹ اور پس منظر کی نیم تاریکی، یہ رنگ کون سے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اس نے کہا، اس میں آپ کی آنکھوں کا رنگ ہے اور آپ کے تبسّم کی جھلملاہٹ اور اس کے چاروں طرف جو فضا ہے وہ میں ہوں، یہ رنگ تو خود میرے لیے بھی نئے ہیں!

نیلوفر مسکرائی بولی، مجھے لگتا ہے جیسے یہ سیپ میرا دل ہے اور اس میں سے نکلتا ہوا پودا اور اس کے شگوفوں پر سچے موتیوں کی جھلملاہٹ، میری محبّت!

وہ مسکراتا رہا تو نیلوفر نے کہا۔۔۔ آج میں اپنے دل کی بات کہوں کتنا اچھا ہو کہ اس تصویر کے سب رنگ اور ان رنگوں کو سمیٹنے والی انگلیاں یکجا ہو جائیں، یہ میری خواہش ہے!

اور اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ وہ تلخی سے مسکرایا، بعض لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کی سب خواہشیں پوری ہو جاتی ہیں اور نیلوفر نے اس کی خواہش کی تھی وہ اس کی بہت بڑی قدردان ثابت ہوئی۔ وہ اچھے کپڑوں، اچھے زیوروں اور اچھی چیزوں کی شوقین تھی اور نوادرات کی دلدادہ! اس کی تصویریں نیلوفر کی عالی شان کوٹھی کے تمام اہم گوشوں میں آویزاں تھیں۔ اس نے سوچا، ہاں کتنا بڑا اکرم تھا کہ نیلوفر نے خود اسے کسی دیوار کی زینت نہیں بنایا۔ وہ اس کی کس قدر دان تھی۔ جب گھر میں کھانے کی محفلیں جمتیں اور جام کھنکتے اور چپے چپے میں روشنیاں تیرتیں تو نیلوفر بڑے ٹھسّے سے اِدھر سے اُدھر اپنی ساری کا آنچل لہراتی پھرتی، جگمگاتے فانوسوں کے نیچے عزت مآب مہمانوں کا استقبال کرتی اور باری باری

سب سے اس تعارف کراتی، میرے شوہر، ملک کے سب سے بڑے مصوّر، آپ حضرات چاروں طرف جو تصویریں دیکھ رہے ہیں یہ تمام ان کی بنائی ہوئی ہیں۔

پھر جب دُودھیا فانوسوں کی روشنیاں دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی گئیں تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی خواب گاہ میں لگی ہوئی سیپ اور شگوفوں والی تصویر کے رنگ دھندلے پڑتے جا رہے ہیں۔ ایک دن اس نے اپنے اس وہم کا ذکر نیلوفر سے کیا تو وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی —— او رہ ڈارلنگ تم کیسی باتیں کرتے ہو، سارے رنگ ویسے ہی ہیں، میرا خیال ہے تم بہت زیادہ کام کر کے تھک گئے ہو، اتنی محنت نہ کیا کرو! پھر وہ نخرے سے بولی، خدانخواستہ اگر تمہاری صحت کو کچھ ہو گیا تو میں مر ہی جاؤں گی، دیکھو نا ویسے بھی میں ان دنوں کتنی پریشان ہوں، بیچاری پنکی کو نجانے کیا ہو گیا ہے، صبح سے ذرا دودھ نہیں پیا اور اُبکائیاں لیتی پھرتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی الا بلا کھا گئی، نجانے ان بلیوں کو ذرا دیر میں کیا ہو جاتا ہے؟ پھر وہ اپنے ملازم پر برس پڑی —— اور تم سے کہا تھا کہ ڈاکٹر کو بلواؤ، جگنو کو بھی دکھانا ہے صبح رائیڈنگ میں بھی مزہ نہیں آیا، پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ کل سے لنگڑا رہا ہے! اس کے بعد وہ دوبارہ کہنے لگی ہاں تو ڈارلنگ میں یہ کہہ رہی تھی کہ خدا کے لئے اپنا خیال رکھو اور دیکھو آج میں نے پارلیمنٹ کے نئے ارکان کو پارٹی دی ہے، سب کے سب آئیں گے ذرا ان سے قاعدے سے ملنا اور دیکھو وہ جو سردار صاحب ہیں نا ان کا بطور خاص خیال رکھنا، اور لو میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ ان کی ایک بیٹی ہے بڑی کیوٹ سی، وہ تمہاری بڑی فین ہے، وہ بھی آئے گی، اُسے ذرا —— ! نیلوفر نے آنکھ ماری۔

اس کا کیا مطلب؟ وہ بولا، تم مجھے نمائش کا جانور سمجھتی ہو؟ ویسے بھی مجھے وہ مچھندر بالکل پسند نہیں وہ جب غیر ضروری طور پر تمہارے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے تو ——

تو ـــــ!

وہ ہنسی ـــ ڈونٹ بی سلّی، یہ سب کرنا پڑتا ہے، پتہ ہے سردار پارٹی کا بڑا ہی بااثر رکن ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اسمبلی کی خاتون رکن نامزد ہونے میں مدد دے گا، کیا سمجھے؟

اور وہ لڑکی کا کیا چکر ہے؟

نیلوفر مسکرائی، بھئی وہ تمہاری پرستار ہے آخر اس میں بُری بات کیا ہے اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنی تصویروں کے لئے تازہ رنگوں کی ضرورت ہے، کیوں؟

میں لعنت بھیجتا ہوں، وہ پھنکارا، یہ بات میری اخلاقیات کے خلاف ہے، میں سچا آدمی ہوں اور ـــــ!

سچائی کے ساتھ بھوکا رہنا چاہتا ہوں! نیلوفر نے طنزیہ لہجے میں اس کا فقرہ مکمل کیا، خالی رنگوں سے تمہارا پیٹ بھر سکتا ہو گا لیکن یہ بات میری عقل کے خلاف ہے!

نیلوفر نے کہا ـــ سنو تم مشہور ضرور تھے لیکن خوشحال نہیں اور میں شہرت اور خوشحالی دونوں کو تمہارے لئے تسخیر کرنا چاہتی ہوں، جان میں تمہاری شہرت کی کرنسی کو بھنانا چاہتی ہوں!

اچانک برابر والا شخص چیختا ہے، ارے میرا کارڈ، میرا کارڈ!

وہ چونک کے دیکھتا ہے، ہوا کے جھونکے سے برابر والے کا کارڈ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا ـ وہ آدمی دوڑ کے اپنا کارڈ اٹھا لاتا ہے ـ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہے ـ لوگ دم بخود بیٹھے ہیں، تمام مرد اور عورت ـــ اور صدا لگ رہی ہے ـ

وہ سوچتا ہے، اس شام صدا لگانے والی اس کی بیوی تھی ـ جلتے فانوسوں کے نیچے مہمان آپس میں قہقہوں کے وزیٹنگ کارڈوں کا تبادلہ کر رہے تھے ـ وہ دیر سے ایک

تصویر کے پاس کھڑا تھا جس کے رنگ دھندلا رہے تھے کہ اس کی بیوی اسے پکارتی ہوئی آئی۔

اوہ ڈارلنگ، وہ خفا ہو کے بولی، کمال کے آدمی ہو سنتے ہی نہیں میں اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں!

میں ذرا اس تصویر کے پاس کھڑا تھا، اس کے رنگ ——!

تصویر —— تصویر —— نیلوفر جھلا کے بولی، خدا کے لئے کبھی تو رنگوں کی کوٹھڑی سے باہر آجایا کرو، بس ہر وقت تصویروں میں مگن رہتے ہو!

تصویریں تو میری پہچان ہیں! اس نے منمنا کے کہا۔

نیلوفر نے کہا —— ٹھیک ہے بابا لیکن تمہیں پتہ ہے اس وقت باہر کتنے بہت سے لوگ تمہاری وجہ سے پریشان ہیں، تمہارے کتنے ہی پرستار!

اسی وقت ایک شخص اپنی طویل القامت مونچھوں پر سوار ہو کے نہایت دیدہ دلیری سے ان کے کمرے میں گھس آیا۔ اخاہ جناب —— اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا، تو آپ ہیں وہ عظیم مصوّر جس نے نیلوفر بیگم کو اپنے رنگوں سے گھائل کیا، خوب صاحب ہم آپ سے ملے بغیر ہی آپ کی فنکاری پر ایمان لے آئے ہیں! پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا، تو آپ تصویریں بناتے ہیں، ٹھیک مگر جناب جس کے پہلو میں نیلوفر بیگم جیسی چلتی پھرتی تصویر موجود ہو بھلا اسے مصوّری کی کیا حاجت ہے؟

اس نے غصّے سے نیلوفر کو دیکھا۔ نیلوفر نے کھنکار کے کہا —— ڈارلنگ ان سے ملو یہ بہت بڑے بزنس ٹائکون ہیں، صنعت کار اور سماجی کارکن، نہایت مہذب، شائستہ اور پُر مذاق، یہ تم سے ملنا چاہتے تھے —— کہتے تھے، میں ایک عظیم الشان آرٹ گیلری بنوانا چاہتا ہوں!

وہ شخص گرج کے ہنسا اور پھر ٹوٹے پرنالے کی طرح نیلوفر پر گرتا ہوا بولا ــــ بس جی یہ سب آپ کی بیگم کی مہربانی ہے ان کی وجہ سے ایک شخص مصوّر ہو سکتا ہے تو کیا کوئی دوسرا فن کا پرستار نہیں ہو سکتا؟

نیلوفر نے کہا ــــ سیٹھ صاحب آپ کو میرے ہسبنڈ (HUSBAND) کی تصویریں پسند آئیں؟ اس شخص نے دیواروں پر نظر دوڑائی اور بولا ــــ کیوں نہیں، کیوں نہیں، بہت اچھے مصوّر ہیں آپ کے شوہر! پھر وہ اس کی طرف مڑا اور کہنے لگا ــــ ویسے یار تم، ہو رنگین مزاج آدمی، ننگی عورتوں سے تمہیں خاص رغبت ہے خاصی فحش تصویریں بناتے ہو، فحاشی ہے میں انہیں اپنی آرٹ گیلری میں تو نہیں سجا سکتا بھئی فن اپنی جگہ ہے مگر اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے ویسے میں مانتا ہوں کہ تمہاری نیوڈز (NUDES) دیکھ کے برف سے ترشے ہوئے بدن چھونے کا احساس ہوتا ہے مگر پھر بھی ــــ!

نیلوفر نے کہا ــــ جناب آپ نے شاید وہ تصویریں نہیں دیکھیں، لینڈ اسکیپ پینٹنگز! ہاں ہاں، وہ بولا، ان کا کیا کہنا، جنگل اور پہاڑ ــــ وہی تو اصل مصوّری ہے، بھئی ماشاءاللہ کیا خوبصورت جنگل بنائے ہیں بالکل اصلی!

تھوڑی دیر بعد جب نیلوفر دوبارہ اس کے پاس آئی تو اس نے غصے سے کہا، آج تم اس اژدہے کو کہاں سے پکڑ لائیں آخر وہ تم سے اتنا بے تکلف کیوں ہو رہا تھا؟ اور وہ مچھندر کہاں گیا جو تمہارے لئے سر کے بل کھڑا ہونے کو تیار تھا، کمینہ ــــ!

وہ ــــ نیلوفر نے بے نیازی سے کہا، وہ بیچارہ تو گیا جیل میں!

جیل میں؟

ہاں بس انقلاب زمانہ، شاہی گئی اور آزادی بھی، میں نے اسے اپنی فہرست سے

خارج کر دیا ہے!

اچھا ــــ وہ جل کے بولا، تو اب اژدھے کا نمبر ہے یہ کب اندر ہوگا؟

نیلوفر نے اپنے نوکیلے ناخنوں کا معائنہ کر کے کہا ــــ یہ بڑی طاقت ور بلا ہے، اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، بڑی اونچی شے ہے اور اس کی رسائی، بس یہ سمجھو کہ اوپر والوں کی ڈوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں تبھی تو میری ہمتیں بلند ہیں، میں تمہارے نام سے ایک شاندار آرٹ گیلری کھولنا چاہتی ہوں اور مصوری کا اسکول ــــ تم آرٹ میں گم رہنا اور میں ــــ!

اور تم ــــ وہ غصے سے بولا، تم کیا تیر مارو گی؟

وہ مسکرائی ــــ میں قوم کی خدمت کروں گی، قومی بھلائی کا کوئی بہت بڑا کام کروں گی، مثلاً میں چاہتی ہوں کہ اگر اژدہا قابو میں آجائے تو اس کی مدد سے کوئی بڑا سا رفاہی ادارہ کھولا جا سکتا ہے جیسے کوئی بلڈ بینک ــــ!

کیوں، وہ طنز سے بولا، اس لئے کہ وہ دوسروں کا خون چوستا ہے!

نیلوفر ہنسی ــــ اچھا بلڈ بینک نہ سہی چلو کوئی آنکھوں کا بینک سہی!

اس نے کہا ــــ ہاں آنکھوں کا تو خاصا معقول ذخیرہ ہوگا اس کے پاس، وہ لوگوں کی آنکھیں نکالنے میں ماہر معلوم ہوتا ہے!

نیلوفر بولی ــــ کچھ نہ سہی تو ایک بڑا سا بیوٹی کلینک، دستکاری کا اسکول، خواتین کی بہبود کی ملک گیر انجمن، کام کرنے کے بہت سے مواقع ہیں۔

اس نے کہا ــــ مگر مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں تم آخر کیا کرتی پھر رہی ہو؟

نیلوفر ہنس پڑی ــــ بات یہ ہے مادھو میاں کہ جو کام تمہیں کرنا چاہیے تھا وہ میں

کر رہی ہوں، مجھے پتہ ہے تم سے تو کچھ ہو گا نہیں، لوگوں سے تم مل جُل نہیں سکتے، جھوٹ بولنے سے تمہارے پھیپھڑے کمزور ہو جائیں گے، شراب کی لذّت سے تم آشنا نہیں، جوئے کے قابل تمہاری عقل نہیں، تم تو ہو صرف ایک ناکام آدمی پھر میں کیا کروں؟ آخر اتنی بڑی کوٹھی، یہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ؟ اور تم ہو کہ بس گناہ و ثواب کی باتیں کرتے ہو، جزا و سزا کے قائل، ارے بابا آدمی بنو آدمی تم تو آدمی کی تصویر بنے ہوئے ہو، گناہ کے بغیر مجھے پتہ ہے کہ آدمی بننا بہت مشکل ہے، تم اگر حشر کے دن فرشتوں کی فہرست میں اپنا نام لکھا کے، اسنو بال، جیتنا چاہتے ہو تو بعد میں اپنے گناہوں کی سلیٹ صاف کر دینا لیکن پہلے گناہ کرو تو سہی! اللہ تم سے کتنا مایوس ہو گا۔

اسی وقت اژدہا گرم گرم پھنکاریں چھوڑتا ہوا اندر آگیا۔ اس نے پیچھے سے نیلوفر کو پکڑ لیا اور اس کی بغلوں میں گدگدیاں کرنے لگا۔ نیلوفر کے منہ سے مترنم ہنسی کا فوارہ چھوٹا، ہٹیئے آپ بڑے ——! وہ اسے دھکیلتی ہوئی دروازے کی طرف چلی۔ اژدہے نے اس کی طرف دیکھ کے کہا، آیئے مصوّر صاحب آپ بھی چلیں!

کہاں —— ؟ اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

ارے آئیں بھی —— ! وہ گرم گرم بھاپ چھوڑتا ہوا بولا۔ آپ تصویروں سے باہر آئیں تو میں آپ کو ایک نئی دُنیا دکھاؤں!

نیلوفر نے اصرار کیا، ارے آؤ نا ڈارلنگ، سیٹھ صاحب کتنی محبت سے بُلا رہے ہیں!

پھر اژدہے نے اس کی طرف منہ کر کے اس زور سے آتشیں پھونکیں ماریں کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا مرتے ہوئے اسے یوں لگا کہ جیسے سب تصویریں غائب ہو ہو چکی ہیں اور میٹالی دیواروں پر صرف سیاہ چوکھٹے ٹنگے ہوئے ہیں۔

اور اب ہر شخص کے ہاتھ میں کارڈ ہے اور ایک شخص پکارتا ہے۔

وہ سوچتا ہے، چلو یہ بھی اچھا ہوگا جب اژدہے کا سر کچلا جائے گا اور اس کُتے کی بچی کو سالے کئے دھرے کا حساب دینا پڑے گا اور انگارے نگلنے پڑیں گے تب پتہ چلے گا کہ عذاب کیا ہوتا ہے۔

ارے —— برابر والا آدمی اس کا شانہ ہلاتا ہے، کیا سو رہے ہو، کالو، کالو، وہ پکار رہا ہے۔

لوگ اپنے کارڈوں پر جھکے ہوئے ہیں، سب مرد و عورت!

وہ غور سے سنتا ہے۔ آواز لگ رہی ہے اور پکارنے والا پکار رہا ہے۔

ون پریٹی وومن (ONE PRETTY WOMAN) —— نمبر ففٹی سیون (No 57)!

گیو دائی لیڈی اے پارٹنگ کس (GIVE THY LADY A PARTING KISS) نمبر سکسٹی سکس (No 66)! وہ اپنے کارڈ کو دیکھتا ہے۔ بیچارہ ناکام آدمی! وہ سوچتا ہے اس کے کارڈ پر ہنوز اس کے گناہوں کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔

پکارنے والا پھر پکارتا ہے: لانگ لیو ڈریگن (LONG LIVE DRAGON) نمبر ففٹی سیون! وہ بیتاب ہو کے سامنے دیکھتا ہے، یکایک ہجوم کے بیچوں بیچ اژدہے کا سر ابھرتا ہے جو اپنا کارڈ اٹھا کے چیختا ہے —— ہاؤس!

اژدہا تمتماتے ہوئے چہرے سے اسٹیج کی طرف بڑھتا ہے اور وہ رنگین قمقموں کی روشنی میں دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی اژدہے سے لپٹی ہوئی ہے اور اس کے بدن کے جلتے ہوئے رنگ تصویر کے چوکھٹے سے باہر نکل گئے ہیں۔ لوگ پر زور تالیاں بجاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بے تصویر سیاہ چوکھٹے میں جڑا ہوا پاتا ہے۔

زمین

نجانے وہ لوگ کب سے اس بھٹکے ہوئے جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ بیرونی دُنیا سے ان کا کوئی رابطہ نہ تھا اور ان کی محدود کائنات بیقرار پانی کی سبز فصیلوں سے گھری ہوئی تھی اور سر پر نیلے رنگ کا کٹورا معلق تھا۔ جس کی ڈھلوانوں پر ہوا کی غیر مرئی انگلیاں آنے والے موسموں کے پیام لکھتی رہتیں۔ اُسے یاد نہیں تھا کہ سفر کب شروع ہوا تھا۔ یہ یاد کرنے کی یہاں کسی کو مہلت بھی نہیں تھی اس لئے کہ سب لوگ اپنے سفر کا جشن پورے انہماک سے منا رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ رقص گاہ میں ناچتے گاتے شور مچاتے جوڑوں کو آدھی رات نذر کر کے اپنے کیبن میں پہنچا تھا اور بدن کو کپڑوں کی ذلت سے نجات دلانے کی صرف آدھی مہم سر کر پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نہایت بیتاب دستک۔

اس نے ایک بار پھر خود کو نئی مہم کے لئے تیار کیا اور دروازہ کھولا۔ شتر مرغی کھڑی تھیں، اپنے خاص انداز میں۔ آنکھوں میں پیام اور ہاتھوں میں دو چھلکتے جام لئے۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی ایک پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ ہیلو۔ خدا کا شکر ہے تم ابھی سوئے نہیں۔ اس نے کہا ”نہیں ابھی وقت ہی کیا ہوا ہے صرف تین ہی تو بجے ہیں!“

ہنس کے بولیں۔ ”تمہیں سونے کا بہت شوق ہے حالانکہ یہ جاگیردارانہ معاشرے کی لعنت ہے۔ چلو اوپر چلیں، دیکھیں رات کے جادو نے عرشے پر کیا حسن بکھا رکھا ہے؟

عرشے پر حسن و حُسن تو کچھ نہیں تھا البتہ پھیکی چاندنی کی باریک جھلی سارے منظر پر چڑھی ہوئی تھی اور جہاز کے پہلوؤں میں سفید جھاگ کے منہ زور اژدہے پھنکار رہے تھے۔

شریمتی نے ریلنگ سے کمر ٹکا کے ایک سانس میں اپنا جام خالی کر دیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "یقین کرو تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے گویا میں نے یہ سفر صرف تمہیں دریافت کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ——؟" اس نے ایک نظر ان کے چہرے کو دیکھا اور جواب اس کے گلے میں اٹک گیا اس لئے کہ موصوفہ کے منقش چہرے کے پیچھے اسے جھریوں کا وہ سمندر نظر آیا جس میں لگتا تھا کہ ناکام محبتوں اور خاک شدہ آرزوؤں کے ہزارہا سفینے غرق ہو چکے ہیں۔ پھر جب انہوں نے وارفتگی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ اس کے حوالے کئے تو اسے یوں لگا جیسے دو لجلجے مینڈک پھدک کے اس کی مٹھیوں میں آ گئے ہوں۔

اس نے کہا۔ "مگر سنو تمہیں انتظار کا ذرا خیال نہیں، اسے کس قدر افسوس ہو گا، وہ تو تمہارے لئے اپنی داڑھی تک منڈوانے کو تیار ہے!"

گرج کے بولیں —— "کون انتظار؟ کس کا انتظار؟ آج تم نے اسے بال روم میں دیکھا ہوتا، ایسا لگتا تھا گویا وہ میرے علاوہ ہر عورت کی دُم سے بندھا ہوا ہے۔ آج تو وہ اس لال بالوں والی پر لٹو ہو رہا تھا جو کل تک کیبن نمبر ۵۰۱ میں رہنے والے چمڑے کے تاجر کی کشش ثقل میں گرفتار تھی۔" انہوں نے تن کے کہا —— "تم خود بتاؤ بالوں کو چھوڑ کے کون سی ایسی چیز اس ٹھگنی عورت کے پاس ہے جو مجھ میں نہیں —— اور ذرا میرا قد تو دیکھو؟" اس نے کہا —— "ہاں قد تو آپ کا ماشاءاللہ ایسا ہے کہ جس سے مردوں کو حسد ہونا چاہیئے، ویسے آپ کو انتظار کو ایک اور موقع دینا چاہیئے، ممکن ہے وہ آ تے!"

شُتر مرغی نے ایک ادا سے سر کو جھٹکا اور کہا ــــ "میں تمہاری طرح غیر ضروری طور پر اُمید پرست نہیں!"

دوسری صبح، وہ کافی بار میں بیٹھا ہوا ہلکی دھنوں پر رات کی غنودگی کا مزہ لے رہا تھا کہ انتظار اس کے پاس آیا اور کندھے پر ہاتھ مار کے بولا: "سُنا تم نے میں نے وہ لال بالوں والی چڑیا ــــ"

اس نے انتظار کی طرف دیکھا۔ اس کی بھوؤں کی طاق میں سبز آنکھ چمک رہی تھی۔

اس نے کہا: "انتظار ڈیئر، مجھے ساری اطلاعات ملتی رہتی ہیں اور مجھے تمہاری اس تازہ نقب زنی کا بھی علم ہو گیا تھا، مگر وہ چمڑے کا تاجر ــــ؟"

"چمڑے کا تاجر؟" انتظار نے قہقہہ لگایا۔ "وہ جائے جہنم میں، ویسے میں نے دیکھا ہے کہ وہ آجکل چیف انجینئر کی تتلی پر مہربان ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہے نا، کیا خوب لڑکی ہے؟ جب ڈانس کرتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی جل پری فرشِ زمین پر تیرنے کی کوشش کر رہی ہو!"

اُس نے حیرت سے پوچھا ــــ "اور انجینئر؟"

"انجینئر" ــــ انتظار نے کہا ــــ "میں کوئی خدائی فوجدار ہوں کہ سب کی ٹوہ لیتا پھروں، ویسے میں نے سُنا ہے کہ وہ اب کسی اور قبالہ کے چکر میں ہے!"

اس نے کہا ــــ "جیسے آجکل تمہیں لال پری کا بُخار چڑھا ہوا ہے!"

انتظار ہنسا ــــ "تم نے ٹھیک کہا وہ لال پری ہے، اس کے لال بالوں کو اگر غور سے دیکھو تو پتہ چلے گا کہ جیسے ایک نئی دُنیا آنکھوں کے سامنے آ گئی ہے۔ ایک شہد رنگ خوابناک دُنیا، جس میں زمین سے آسمان تک لال پھولوں کا ڈھیر ہے اور مست کرنے والی

خوشبوئیں آنے والوں کا استقبال کرتی ہیں!"

اس نے کہا۔ "اچھا تو یہ ہے وہ راز جس نے تمہیں لال پری کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے!"

انتظار بولا "نہیں وہ تو ایک کائنات ہے جس میں کئی دُنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، بازوؤں کی مشعلیں، چھاتیوں کے چراغ اور پیٹ کا سورج ــــ روشنی کی اس کائنات میں اتنی تمازت ہے کہ بس جل کے بھسم ہو جانے میں خیریت ہے!"

اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "رات شتر مرغی آئی تھی میرے پاس!"

"سیڈ! Sad ــــ" انتظار کا ردِّ عمل مختصر تھا۔

اس نے کہا۔ "تمہاری شکایت کر رہی تھی کہ تم نے اسے فراموش کر دیا ہے!"

"کیا ــــ؟ انتظار نے اچانک سبز آنکھیں اتار کر سفید آنکھیں لگالیں۔ "اچھا جی تو گویا وہ بھی کوئی یاد رکھنے کی چیز ہے؟ میں کہتا ہوں اس بڑھاپے میں اسے یہ تمنّا کیوں ہے؟ تم نے اس کے چہرے کی جھریاں دیکھی ہیں اور اس کے نقلی دانت اور اس کا جناتی قد ــــ معاف کرنا یار اس سے بہتر تو خود میری ماں تھی!"

ماں ــــ اسے ایک دھچکا سا لگا، مائیں کیسی ہوتی ہیں، مائیں ایسی ہوتی ہیں، اُس نے اپنے ذہن میں اپنی ماں کا تصوّر قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں کچھ بے ربط تصویریں چنگاریوں کی صورت چمک کے معدوم ہو گئیں اسے اپنی ماں کی شکل یاد نہ تھی اس لئے کہ وہ اس وقت اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی جب اس کی عمر صرف تین سال تھی۔ اس نے گاؤں والوں سے سنا تھا کہ اس کی ماں کی موت کا سبب اس کے باپ کی بے وفائی تھی جس نے شادی تو اس کی ماں سے کی لیکن محبت کا خراج چھپ چھپ کے کسی

ستم پیشیہ ڈومنی کو اداکرتا رہا۔ اس نے سوچا، اگر میری ماں زندہ ہوتی اور اگر وہ آج میرے پاس ہوتی تو شاید ایسی ہوتی۔ ایسی ہی جھرّیاں اس کے چہرے پر ہوتیں جنہیں وہ ہر وقت رنگوں کی نقاب میں چھپائے رکھتی اور منہ کھولتے ہوئے بھی اس احتیاط سے کام لیتی کہ کسی کو اس کے منہ کے اندر سونے کی داڑھوں کی خفیہ کاشت کا پتہ نہ چل سکے!

پھر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے عرشے پر آگئے۔ سوئمنگ پول کے قریب، دھوپ کے شامیانے میں سنہری بدن والی مچھلیاں کروٹیں بدل رہی تھیں۔ انتظار کے نتھنے پھڑکنے لگے اور آنکھوں میں روشنی کی سبز لہریں اٹھنے لگیں۔ کہنے لگا۔ "میرا جی چاہتا ہے رات کی تنہائی میں باری باری اُن سب کے حسنِ خداداد کو خراجِ تحسین پیش کروں!"

اُس نے کہا ـــــ "میرا خیال ہے کہ اب رات شاید ہی تمہارے شوقِ دید کے کام آسکے اس لئے کہ ایسی کون سی چیز اجالے میں پوشیدہ ہے جسے دیکھنے کے لئے تمہیں اندھیرے کی آنکھ کی ضرورت پڑے گی؟"

سوئمنگ پول میں ربڑ کی گیند کے لئے چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ چمڑے کا تاجر پانی میں انجینئر کی تتلی کے پر نوچ رہا تھا اور انجینئر کے ہاتھوں کے کانٹے ایک اور حسینۂ طنّاز کے گلابوں میں چبھنے کے لئے بیتاب نظر آتے تھے جو اس پر اپنے منہ سے پانی کی پھواریں چھوڑ رہی تھی۔

انتظار نے بیتابی سے جلتے ہوئے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو میں ذرا لال بالوں والی کو دیکھتا ہوں!"

وہ کچھ دیر بعد لوہے کی چکردار سیڑھیوں سے اُتر کے اپنے کیبن کی طرف چلا تو کوریڈور میں کاؤنٹ ڈگلس کھڑے ہوئے ملے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولے۔ "اوہ مسٹر مجھے آپ ہی

کا انتظار تھا ذرا میرے کیبن میں تو آئیں، ایک ضروری کام ہے!" وہ اندر چلا گیا۔ ان کے کیبن میں ہر طرف نوٹ ہی نوٹ پھیلے ہوئے تھے۔ ڈالر، پاؤنڈ اور فرانک۔

وہ کہنے لگے۔ "کچھ حساب میں گھپلا ہے۔ میں صبح سے گن رہا ہوں مگر ٹوٹل صحیح نہیں آ رہا ہے، آیئے ذرا چیک تو کریں!" پھر وہ کرنسی نوٹوں کے ایک ڈھیر پر بیٹھ گئے اور جھک کے پورے انہماک سے نوٹوں کی گنتی میں مصروف ہو گئے۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا انہیں اپنے کام میں منہمک دیکھتا رہا، پھر چپ چاپ باہر نکل آیا۔ مسٹر ڈگلس کی انگلیوں میں نوٹ پھڑ پھڑانے کی آواز کسی بھوکے پرندے کی طرح دُور تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔

اسے راستے میں وہ کوٹھڑی بھی ملی جس کی تاریکی میں اس بوڑھے آدمی کا بدن نارنجی لبادے کے شعلوں میں روشن تھا جو کبھی کبھی طوفانی لمحوں میں بند دروازوں سے نکلتا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی سانسوں کی زعفران بانٹتا ہوا چلا جاتا، ایک دن اس نے اُسے ہجوم میں سے لوٹتے اور بند کوٹھڑی میں داخل ہوتے دیکھا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اس کے سینے میں ایک چاقو پیوست تھا۔

شام کے قریب اس کے کیبن کو کسی نے کھٹکھٹایا۔ اس نے اٹھ کے دیکھا تو پڑوس کے کیبن کا آٹھ سالہ بچّہ، ٹونی کھڑا تھا۔ "ہیلو ٹونی، کیسے آئے؟" اس نے پوچھا۔

"شام بخیر جناب —— میں اکیلا ہوں نا، سوچا کہ آپ سے باتیں کروں!"

"کیوں بھئی تم اکیلے کیوں ہو؟"

"اصل میں —— ٹونی نے سرگوشی کی —— وہ دونوں جو خود کو میاں، بیوی بتاتے ہیں دوپہر سے لڑ رہے ہیں، سمجھ گئے نا۔ ایک بار میں نے بیچ بچاؤ کی کوشش بھی کی تو انہوں نے ڈانٹ کے کہا، تم کون ہوتے ہو ہمارے درمیان بولنے والے، چلو اپنا

کام کرو!"

ٹونی نے پوچھا "آپ بتا سکتے ہیں یہ دونوں اتنا لڑتے کیوں ہیں؟"

اس نے بچے کو چمکار کے کہا "ٹونی میاں یہ دونوں لڑتے نہیں ہیں گو کہ تمہیں یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ لڑ رہے ہیں مگر وہ لڑتے نہیں ہیں بیٹے، وہ تو ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں!"

ٹونی نے کہا "مگر مجھے اس عورت کی یہ بات بالکل پسند نہیں کہ وہ مجھے سُلاتے وقت اپنا سارا تھوک میری پیشانی پر مل دیتی ہے۔ گندی عورت!"

پھر جب وہ ٹونی کے ساتھ باہر نکلا تو مسٹر ڈگلس کے کیبن کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہیں بدستور نوٹ گننے میں مصروف پایا۔ کافی بار میں پہروں کا ہجوم تھا۔ کارڈ روم میں تاشوں کی محفل جمی تھی۔ انجن روم میں حسبِ معمول بڑی گھما گھمی تھی اور لوگ دوڑ دوڑ کے کام کر رہے تھے۔ کوریڈور میں دور پر ایک خاتون اپنے بالوں میں پھولدار اسکارف باندھے ہوئے جا رہی تھیں۔ ٹونی نے چلّا کے کہا "دیکھیں جناب دیکھیں ــــ وہ عورت جا رہی ہے ــــ وہ عورت جو میرے کمرے میں رہتی ہے!"

اس نے پوچھا "اس وقت یہ کہاں جاتی ہیں؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟" ٹونی نے کہا۔ "عبادت کے لئے فادر الکوٹن کے پاس وہ نچلی منزل پر ہی تو ہیں ــــ بہت لوگ جاتے ہیں وہاں ــــ"

تھوڑی دیر بعد جب وہ فادر الکوٹن کی عبادت گاہ کے سامنے سے گزرے تو اندر سے فادر کے زور زور سے خطبہ دینے کی آوازیں آ رہی تھیں، راستی اور راستبازی، سچائی، عمل، گناہ، ثواب، جزا، سزا ــــ! اور جہاز اپنی راہ پر چلا جا رہا تھا۔ بال روم

کی روشنیوں کے آڑے ترچھے زاویوں میں اجنبی جسم ضرب تقسیم ہو رہے تھے اور موسیقی کی دُھنیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔

ایک شام وہ عرشے پر کھڑا نیم خوابیدہ آنکھوں سے بپھرتے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ رہا تھا کہ انتظار آدھمکا۔ اس نے پوچھا "کوئی تازہ خبر؟ تمہاری لال پری ابھی حیات ہے یا اوروں کی طرح آنجہانی ہو چکی؟"

انتظار جھلا کے بولا ــــ "اجی لعنت بھیجو اس پر ــــ وہ تو گئے موسم کا پھل تھا اس موسم میں کہاں؟ البتہ سنو اہلِ ذوق نے تشنگانِ محبت کی سیری کے لئے ایک نیا طرزِ جنوں ایجاد کیا ہے اگر تمہیں موافق آئے تو آؤ ہماری بانہیں کھلی ہیں ورنہ تم جانو اور تمہارا کام ــــ!"

اس نے پوچھا "ایسا کیا تیر مارا ہے تم لوگوں نے، کچھ پتہ تو چلے؟"

کہنے لگا ــــ "یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ ہم نے سرچشمۂ محبت کو عام کر دیا ہے!"

اس نے پوچھا ــــ "کیسے؟"

انتظار نے جیب سے ایک مخملیں تھیلی نکال کے اس کی طرف بڑھائی ــــ "لو دیکھو اس تھیلی میں دس انگوٹھیاں ہیں تم اس میں ہاتھ ڈال کے ایک انگوٹھی نکال لو!"

اس نے تھیلی میں ہاتھ ڈالا تو فیروزے کی ایک انگوٹھی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ انتظار آنکھ مار کے بولا ــــ "ماننا پڑتا ہے کہ قسمت کے دھنی ہو یار، تمہارے لئے انجینئر کی جل پری کا قرعہ نکلا ہے!"

"کیا مطلب؟" اس نے ہکا بکا ہو کے پوچھا۔

انتظار بولا ــــ "عورت ہر مرد کے لئے ہے کسی کا اجارہ نہیں، اس فلسفے کو بنیاد بنا کے ہم لوگوں نے ایک حلقۂ یاراں ترتیب دیا ہے جس میں زن و شوہر کی تخصیص نہیں،

مرد و عورت کی تمیز ہے۔ دیکھو کس قدر متحرک ہے اس نظام میں۔ یہ نہ صرف یکسانیت، اکتاہٹ اور بیزاری کے خلاف ایک لذیذ احتجاج ہے بلکہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا ایک اچھوتا طریقہ بھی!
اُس نے انگوٹھی واپس لوٹا دی۔ انتظار بولا "افسوس تم مایوس کُن حد تک تنگ نظر آدمی ہو، یہ بات دراصل تمہاری کھوپڑی میں نہیں سما سکتی!" پھر اس کی کالی پُتلیاں غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ مٹیالی کوڑیاں ابھر آئیں اور وہ غصّے سے پاؤں پٹکتا ہوا چلا گیا، اس نے دیکھا ریچھ کے پنجوں کے نشان انتظار کا پیچھا کر رہے تھے۔
وہ دیر سے گُم سُم کھڑا تھا کہ شتر مُرغی اپنے وجود کو تیز خوشبوؤں سے مہکائے ہوئے اس کے سر پر سوار ہو گئی۔ اس کا محنت سے پینٹ کیا ہوا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ اس کی نقلی پلکیں لٹک رہی تھیں اور غازے کی تہوں کے نیچے جھائیاں کلبلا رہی تھیں۔ اس نے آتے ہی کہا۔ تم نے سُنا، انتظار نے اب اور کیا چکّر چلایا ہے؟
"اس نے کہا —— مجھے معلوم ہے!
بولی —— ذرا اس کی ہمّت تو دیکھو وہ مجھ سے میری انگوٹھی مانگ رہا تھا!
"اس نے کہا —— پھر؟
بولی —— پھر کیا، میں نے تھوک دیا اس کے مُنہ پر، سوچو، کوئی میں لنگر کی روٹی ہوں؟ وہ چونک گیا۔ اس نے حیران ہو کے شتر مُرغی کی طرف دیکھا اور اس لمحے وہ اُسے بڑی حسین اور نوجوان نظر آنے لگی جیسے اس نے ایک دم اپنی جون بدل ڈالی ہو۔ اس کے چہرے کی سب جھُرّیاں غائب ہو گئی تھیں اور شرمیلی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو عموماً کنواریوں کی آنکھ میں ہوتی ہے۔
اس نے اپنی حیران نگاہیں سمندر میں بہا دیں جس کی موجوں کا شور ان دونوں کی گردوں

کے سیٹیاں بجاتے جہازوں پر کمندیں پھینک رہا تھا۔ پھر اس نے شتر مرغی کو اپنے پتوار نما بازؤں میں لپکے اٹھایا اور کہا۔ "تم بہت دنوں سے میری طرف نہیں آئیں حالانکہ میں تمہاری راہ تک رہا تھا۔" شتر مرغی نے اس کی بانہوں میں دوڑتی ہوئی بجلیوں کے مس ہوتے ہی ایک ایسی بادبانی کشتی کی طرح جھرجھری لی جو عرصے تک ساکت رہنے کے بعد ہوا کے ایک ہی موافق جھونکے سے لہرا کے چل پڑے۔

جب وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نیچے اترے تو رقص گاہ اور کارڈ روم میں پہلے کی طرح شور کی مکھیاں بھنک رہی تھیں اور لوگ اپنے آپ میں مگن تھے۔ کاؤنٹ ڈگلس کے کیبن سے کرنسی نوٹوں کے پھڑپھڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور فادر الکوتن کی عبادت گاہ میں ان کا خطبہ جاری تھا۔ "اور یاد رکھو حشر کے دن جب تم اٹھائے جاؤ گے تو کوئی کسی کا باپ ہوگا نہ کوئی کسی کا بیٹا، کوئی کسی کی ماں ہوگی نہ کوئی کسی کی بیٹی، کوئی کسی کا شوہر ہوگا نہ کوئی کسی کی بیوی، سب رشتے اسی دُنیا کے لئے ہیں!"

اور پھر جب وہ دونوں کیبن میں داخل ہونے والے تھے ٹونی دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "جناب آپ کو پتہ ہے وہ عورت کہتی ہے کہ اس نے مجھے اپنا دُودھ پلایا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا!" یہ کہتے ہوئے وہ شرما گیا۔

اس نے ٹونی کے گال تھپکتے ہوئے کہا۔ "وہ ٹھیک کہتی ہے بیٹے اس لئے کہ وہ تمہاری ممی ہے!" وہ دونوں اندر چلے گئے اور پھر کیبن کا دروازہ اتنے زور سے بند ہوا کہ نچلی منزلوں کا سارا شور، انجن روم کی آوازیں، پادری کا خطبہ، سب کچھ اُس پار رہ گیا۔

جہاز چل رہا تھا اور اس کے ہچکولوں اور شتر مرغی کی بانہوں کی گرمی نے اسے یہ احساس دلایا کہ جیسے وہ ماں کی گود میں ہے۔ جہاز چلتا رہا اور اس نے تصوّر میں دیکھا کہ سمندر سے پرے دور ایک سیاہ لکیر نظر آ رہی ہے جو شاید زمین تھی۔ ❋

کتاب کو تل

انتساب

آدمی کو اپنی زندگی میں تین کام ضرور کرنے چاہئیں۔
ایک کتاب لکھنی چاہیئے
ایک پودا لگانا چاہیئے
ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیئے
میں اپنی اس کتاب کو اس کے نام معنون کرتا ہوں جس کی مدد سے یہ تینوں کام تکمیل کو پہنچے اور جو میری رفیقۂ حیات ہے۔

اس نے کتاب کے پھٹے ہوئے ورق کو اٹھا کے بغور دیکھا، اور پھر صبا کی آواز اس کے کان میں آئی ـــــ کتاب کا انتساب تو اس خوشگوار صبح کی مانند ہوتا ہے جس سے کسی گرم اور روشن کی ابتدا ہوتی ہے۔ سنو میں اپنی زندگی کی کتاب کو تمہارے نام منسوب کرتی ہوں!

باب اوّل

اسے معلوم تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ذات کے کھلے شہر میں بستے

ہیں اور اجنبیوں کا خوشدلی سے استقبال کرتے ہیں۔ اس نے اپنے چاروں طرف تنہائی کی اونچی فصیلیں کھڑی کر رکھی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کتابوں کی صحبت میں آدمی خاموشی کا سفیر ہوتا ہے اور خاموشی روح کی زبان ہوتی ہے مگر صبا کی روح اس کے منہ میں رہتی تھی۔

وہ کہتی ـــــ "مجھے پتہ ہے تم قلعہ بند آدمی ہو، تم مجھے اپنی فصیلوں میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دو گے لیکن پھر بھی ـــ!"

"پھر بھی کیا ـــــ؟" وہ سوال کرتا۔

"پھر بھی میں تمہیں پسند کرتی ہوں!" صبا اس کے ہاتھ سے کتابیں لے لیتی۔

اس نے کتاب کا پھٹا ہوا صفحہ ایک طرف ہٹا کے سامنے دیکھا۔ کتابوں کی الماریوں سے سجے ہوئے ہال کے ایک حصے میں مطالعہ کی لمبی میز تھی اور دوسرے حصے میں چھوٹی چھوٹی ڈیسکوں کی قطاریں ـــــ

اس کی نشست کے دائیں جانب ایک نیم تاریک گیلری تھی جس میں کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں بھی تھیں۔ کتابیں، کتابیں اور کتابیں۔ دیوار کی اینٹیں بھی اسے کتابوں کی طرح لگتیں۔ کبھی کبھی جب وہ کسی کتاب کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا ہوتا تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ اس سے باتیں کرے۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے بدن میں ٹھاٹھیں مارتے خاموشی کے سمندر میں سفر کرتے کرتے اکتا سا گیا تھا۔ کبھی تو خاموشی کی پھولی ہوئی مشک سے آواز کا کوئی قطرہ ٹپکتا۔ وہ اپنی اس خواہش پر خود بھی حیران ہوتا بھلا کہیں کتاب کی بھی آواز ہوتی ہے؟ جب بھی وہ کوئی کتاب کھولتا اس کے گرد آلود اوراق سے پتلی پتلی ٹانگوں والے کالے حروف شہد کی مکھیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے۔ کبھی کبھی اسے یوں لگتا کہ جیسے کتاب کے اندر کوئی سُر قید ہے جو آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے

لیکن وہ لفظوں کے خول سے نکل نہیں پاتا۔

کیا ہر چیز کا ایک خول ہوتا ہے ؟ اس نے سوچا اور صبا نے ایک بار پھر اس کے کان میں سرگوشی کی ــــ "خدا کے لئے تم اپنا خول اتار دو! خول کسی قسم کا بھی ہو بہت ظالم ہوتا ہے اصل کو کبھی سامنے نہیں آنے دیتا!"

صبا کو کتابوں کا بہت شوق تھا۔ اسے گلابی جلد والی کتابیں بہت پسند تھیں لیکن جب کتابیں واپس آتیں تو انہیں پہچاننا مشکل ہوتا، ٹوٹی ہوئی جلد اور پھولے ہوئے اوراق ــــــــ

وہ انہیں دیکھ کر خفگی سے ناک پھلاتا تو صبا مسکرا کے کہتی ــــ "مجھے پتہ ہے تم ظاہری حسن کے پرستار ہو، کتابوں کی بدنمائی تمہیں گوارا نہیں لیکن میری رائے میں ہر کتاب کا ایک رس ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ رس لوگوں تک پہنچا کہ نہیں اور جو کتاب پڑھ لی جائے وہ میرے نزدیک ایسی ہوتی ہے جیسے گنے کا پھوک! تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے کہ میں تم سے کتاب لیتی ہوں اور پھوک واپس کرتی ہوں!"

پھر وہ طنز سے کہتی ــــ "بندۂ خدا! تم تو کتابوں کے گورکن بننے کی کوشش کر رہے ہو، کبھی تم نے یہ بھی غور کیا ہے کہ آخر تمہیں کون سی کتابیں پسند ہیں، کس رنگ اور نسل کی؟"

وہ کہتا ــــ "کتاب تو کتاب ہوتی ہے میرے لئے یہ سب کتابیں ایک جیسی ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہو، کبھی تمہاری نظرِ انتخاب ریاضی کی کتابوں پر پڑتی ہے اور کبھی تم باغبانی کے نسخے جاننے کو بیتاب رہتی ہو۔ تعجب ہے باغبانی بھی کوئی موضوع ہے، لڑکیاں تو عام طور پر کچھ اور ــــــ!"

صبا ہنستی —— "بابا میں سچائیوں کی پرستار ہوں اگر ریاضی کی کتاب میں سچائیاں مہکتی ہیں تو باغبانی کی کتابوں میں ان کے حسن و رعنائی کو دیکھا جا سکتا ہے ویسے بھی یہ میرا پسندیدہ موضوع ہے اس لئے کہ ہر کتاب کا بنیادی مقصد دل و نظر میں پھول کھلانا ہے اور میرے نزدیک اگر کسی کتاب کو پڑھ کے ذہن و دل کے دریچوں میں تازہ خیال کے سُرخ پھول نہ مہکیں تو پھر اسے پھینک دینا چاہیئے —— !"

کبھی کبھی وہ پوچھتا —— "بی بی ذرا یہ بتاؤ کہ تم جو علم کے دریا میں گلے گلے ڈوبی ہوئی ہو اور کسی صورت کتابوں سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں آخر اس کا فائدہ کیا ہے، بس جاؤ اپنا گھر بساؤ !"

وہ ہنستی —— "کمال ہے تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے، زیادہ علم زیادہ انتظار سکھاتا ہے —— !"

ایکبار پھولوں کے موضوع پر ایک کتاب اس کے ہاتھ آگئی ایک خوبصورت کتاب جس کے ہر صفحے پر ہر خوبصورت پھول کے نیچے خاصی بدخطی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ یہ کون بدذوق ہے ؟ وہ بڑبڑایا۔

نرگس کے پھول کے نیچے لکھا تھا —— اور یہ رہا انتظار کا پھول، دیکھو تم جب بھی اس پھول کو دیکھنا، مجھے یاد کرنا !

لو بھئی —— اس نے طنز سے کہا —— "ذرا دیکھنا یہ کس کی کھلی ہوئی آنکھ ہے اور یہ تم، کون ہے ؟"

صبا نے کہا —— "تعجب ہے تم پھولوں کی پکار نہیں سنتے، وہ تو راہ تکتے ہیں !"

اس نے دیکھا، صبا کی آنکھ جھک رہی تھی۔

ایک دن صبا نے اسے ایک کتاب دکھائی جو کسی پڑھنے والے نے کچھ دیر پہلے لا کے اس کی میز پر رکھی تھی۔ جا بجا اس کے حاشیئے بدخط تحریروں سے پُر تھے، گڈمڈ الفاظ، دستخط، پھول، ہونٹوں کی کلی، سوالیہ نشان۔

اس نے دیکھا، ایک صفحے کی ساری عبارت خط کشیدہ تھی اور حاشیئے پر لکھا ہوا تھا، آج میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ یہ مصنف لوگ، یہ کتابیں لکھنے والے ہمیں زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں اور اپنی زبانی ہماری کہانی بیان کرتے ہیں، یہ تحریر جس کے ہر لفظ سے محبّت کی خوشبو آتی ہے لگتا ہے کہ جیسے خود ہماری کہانی ہو! میری خواہش ہے کہ تم خط کشیدہ عبارت کو میری تحریر سمجھ کے پڑھو، میں ان لفظوں کو تمہارے نام —! پھر اس نے خط کشیدہ عبارت کو پڑھنا شروع کیا، یہ ایک مختصر سا خط تھا:

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے
جو محبّت ہے
پہلے کچھ نہیں تھا اور صرف محبت تھی
اس محبت سے کائنات بنی اور آدم کی تخلیق ہوئی کیونکہ
محبت کے ہاتھوں اس کے سر پر دنیا کی بادشاہی کا تاج رکھا جانا تھا
پھر آدم کو محبت ملی
حوا وجود میں آئی
اور محبت نے دونوں کی نسل بڑھائی
اس کرۂ ارض کو آباد کیا
محبت اس کائنات کی ابتدا ہو

اور انتہا ہے، اور

اے ہم نفس!

میں اس کائنات کو جو پوری کی پوری محبت سے معمور ہے

بصد خلوص تیری نذر کرتا ہوں کہ

یہی میرا دل ہے!

کتاب کی حالت دیکھ کر اس نے کہا ——— "لو بھئی یہ بیچاری تو اللہ کو پیاری ہو چکی!"

صبا مسکرائی، اس نے کہا ——— "مگر میرے خیال میں تو یہ زندہ ہوئی ہے اس لئے کہ کوئی کتاب اسی وقت جینا شروع کرتی ہے جب اسے پڑھا جاتا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب اب تمہیں سانس لیتی محسوس ہوگی، ذرا اسے چھو کے دیکھو!"

وہ دونوں ابھی بیٹھے تھے کہ اس زندہ کتاب کو ایک خاتون اچک لے گئیں جو شاید دیر سے اس کی تاک میں تھیں اور صبا نے کہا ——— "تم لاکھ ناراض ہو مگر میں تو یہی کہوں گی کہ محبت کا یہ انداز نہ صرف قابل معافی ہے بلکہ قابل تقلید بھی! اور میرے خیال میں جو کتاب دو انسانوں کو قریب لانے کا فریضہ ادا کرے اس کے مقدس ہونے میں کیا کسر ہے؟"

اُس نے کہا "لیکن میرا ایمان یہ ہے کہ محبت چاہے عورت سے ہو یا کتاب سے دونوں کا احترام ضروری ہے!"

صبا نے کہا ——— "ٹھیک کہتے ہو لیکن شاید تم بند کتاب کو مقدس جانتے ہو، عورت کوئی بند کتاب تو نہیں، میرے دوست جو کتاب پڑھی نہ جائے وہ تو اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو محبت سے محروم رہا ہو یہ اور بات ہے کہ کتاب کا غم طشت از بام نہیں ہوتا جب کہ آنکھ میں آیا ہوا آنسو اس کا راز فاش کر دیتا ہے جس کی شخصیت محبت کے لمس کو ترستی رہی ہو!"

اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا۔ صبا کی کالی آنکھ میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ اس نے حیرت سے پوچھا ــــ "صبا تمہاری آنکھ میں ـــــ ؟"

صبا نے کہا ــــ "دیکھو ہمیشہ کی پھولوں کو عزیز رکھنا!"

بابِ کوفہ

اور وہ حیران تھا۔

ایک بار پھر وہ دونوں اکھٹے تھے۔ موقع ایک دعوت کا تھا جو اس کے ایک دوست کے گھر تھی اور اسے یہ جان کر سخت حیرانی ہوئی کہ وہ تو خود صبا کا گھر تھا۔

مگر اب صبا کی آنکھیں پہلے جتنی سیاہ نہیں رہی تھیں، اس کے بالوں میں چاندی تھی اور گالوں پر گیندے کے پھول کھلے تھے۔

اس نے حیرت سے پوچھا ــــ "ارے کیا یہ تم ہو صبا؟"

وہ کہنے لگی، "مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے مجھے پہچان لیا! پھر وہ آگے بڑھ کے بولی، آؤ ان سے ملو یہ میرے شوہر ہیں!" اور دوسرے ہی لمحے ایک چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو یوں لپک لیا جیسے باز کبوتر کو دبوچتا ہے اور پھر ایک گونجتی ہوئی آواز اس کے وجود پر چھا گئی ـــــ

کھانے کے بعد مہمان سبزہ زار پر جمع تھے کہ میزبانِ مہربان پائپ سلگاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئے ـــــ

"آپ کو ریس کا تو شوق ہوگا؟"

ابھی وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ صبا نے کہا ـــــ

"نہیں انہیں گھوڑوں کا کوئی شوق نہیں!"

"خیر ـــــ میزبان اپنی نکٹائی درست کرتے ہوئے بولے، کوئی حرج نہیں، مچھلیوں سے کچھ شوق ہے آپ کو، میرے پاس آپ کو ان کی کئی نادر قسمیں ملیں گی!"

صبا نے کہا، "انہیں مچھلیوں کا بھی کوئی شوق نہیں!"

وہ کہنے لگا ـــ "اچھا تو اندر چلیئے کچھ نہیں تو ایک بازی برج ہی کی سہی!"

"مگر میں ـــ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے منمنایا، میں برج نہیں کھیلتا!"

"اوہ، میزبان نے تاسّف سے کہا ـــــ آپ برج ضرور کھیلا کریں، یہ زبردست ذہنی سیر ہے، پتہ ہے آپ کو میں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے!"

"اچھا ـــــ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا، کس موضوع پر؟"

"برج کھیلنے کے بارے میں!" میزبان بولے

تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد میزبان دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے ـــ

"ویسے آپ کا مشغلہ کیا ہے؟"

"میں ـــــ اس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے جواب دیا، میں لائبریرین ہوں!"

"کیا ہیں آپ؟ پہلی بار ان کے کچھ پلے نہ پڑا۔ اس نے وضاحت کی ـــــ میں لائبریری میں کام کرتا ہوں!"

میزبان کے ہاتھ سے پائپ چھوٹتے چھوٹتے بچا ـــــ "لائبریری میں اچھا تو ـــ!" صبا نے کہا ـــ "یہ کتابوں کے پہریدار ہیں!"

"اچھا اچھا! ہمارے پاس بھی بہت کتابیں ہیں! میزبان نے شیشے کی الماریوں میں سجی کتابوں کی طرف اشارہ کیا، آپ دیکھنا چاہیں تو ـــــ!" پھر وہ دوسرے مہمانوں کی

طرف متوجہ ہو گئے، جو ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی سجاوٹ کی نادر چیزوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔

"یہ جل پری میں نے روم سے خریدی تھی، انہوں نے زور سے کہا، بدھ کا مجسمہ نیپال سے اور ہاتھی دانت کا استوپہ میں بنکاک سے لایا تھا!"

"نہیں، نہیں جناب یہ ایفل ٹاور پیتل کا نہیں خالص سونے کا ہے، یہ میں نے ــــ!"

اسی وقت ایک نوعمر لڑکا اندر آیا۔ اس کی آنکھ کی سیاہی صبا کی آنکھوں سے مستعار لگتی تھی اور چہرے پر تازگی تھی۔ صبا نے اسے اپنے پاس بلایا، "ادھر آؤ بالی بیٹے ان سے ملو، یہ ہیں تمہارے انکل!"

بالی اجنبیت سے دیکھتا رہا۔

اس نے لڑکے کو اپنے پاس بلایا "تم پڑھتے ہو بیٹے؟"

"جی ہاں ــــ! لڑکے نے بیزاری سے کہا، میں پبلک اسکول میں پڑھتا ہوں اور بورڈنگ میں رہتا ہوں!"

"اچھا تو کیا چھٹی کے دن گھر آتے ہو؟"

"کبھی کبھی ــــ!" لڑکے نے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اس نے پوچھا ــــ "اور کیا مشغلہ ہے تمہارا؟"

"جی میں ــــ لڑکا اکتا کے بولا ــــ میں رائیڈنگ کرتا ہوں، سوئمنگ کا شوق ہے، اسکواشش کھیلتا ہوں اور ــــ!"

"ہاں ــــ اس نے اشتیاق سے پوچھا، اور کیا پسند ہے تمہیں؟"

بالی نے کہا ــــ "کار ریسنگ اور ــــ!"

اچانک میزبان بہادر بیچ میں کود پڑے "ہاں ہاں کیوں نہیں، آخر میرا بیٹا ہے آپ کو شاید پتہ نہیں، میں دو مرتبہ قومی کار ریلی جیت چکا ہوں"

اس کے بعد حاضرین کی گفتگو کار کے نئے ماڈلوں اور پیٹرول کے بحران سے ہوتی ہوئی وی سی آر پر چلنے والی فلموں، ٹیلی ویژن کے پروگراموں اور انگریزی تصویروں کی طرف نکل گئی۔

صبا نے کہا "سنو تم چاہو تو کتابیں دیکھو یا تم پھولوں کو دیکھنا پسند کرو گے، میں نے بہت سی قسموں کے پھول جمع کر رکھے ہیں!"

میزبان چہکے۔ "ہاں جناب آپ پھولوں کو تو ضرور دیکھیں ہماری بیگم تو اچھی خاصی باغبان ہیں انہیں پھول بہت پسند ہیں، ایک پھول انہوں نے اپنے معدے میں بھی اُگا رکھا ہے!"

ارے ——! اسے رنج ہوا۔

صبا نے کہا —— "تم کتابیں دیکھو!"

پھر وہ اٹھا اور شیشوں کے پیچھے سجی ہوئی کتابیں دیکھنے لگا۔ وہاں ہر موضوع پر کتابیں موجود تھیں، شاعری، ڈرامہ، مصوری، فلسفہ، مشاہیر کے قصے —— آخر پڑھے لکھے لوگوں کا گھر تھا۔ پھر اس نے ایک کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا جو نسبتاً ذرا پرانی تھی اور اس پر بہت ساری گرد تھی۔ گرد جھاڑ کے جب اس نے کتاب کھولی تو اس کا جی دھک سے رہ گیا۔ کتاب بالکل بے داغ تھی اور اس کے صفحات آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

"ارے —— وہ ہکلا کے بولا —— یہ تو ——!"

"یہاں کسے اتنی فرصت ہے — !صبا نے اطمینان سے کہا، اور میں بھی اب اپنے گھر کے لان پر بس آنکھوں کی فصلیں اگاتی ہوں!"

اس نے صبا کی آنکھوں کے اداس پھولوں کو غور سے دیکھا اور سوچا، یہ آنکھیں بھی تو اس کتاب کا حسین انتساب ہیں جو اب تک شاید کسی نہیں پڑھی!

گزشتہ سے پیوستہ

اس نے کتاب کے پھٹے ہوئے صفحے کو ایک بار پھر اٹھایا

آدمی کو اپنی زندگی میں

ہاں آدمی کو اپنی زندگی میں

اس نے سوچا، آخر کیا جھک مارنی چاہیئے۔

ایک کتاب لکھنی چاہیئے، مثلاً برج کھیلنے کی کتاب!

ایک پودا اگانا چاہیئے، مثلاً سردھری کا پودا!

ایک بیٹے کا باپ بننا چاہیئے مثلاً وہ جو اجنبی ہو!

اس نے پھٹا ہوا صفحہ ایک طرف ہٹا کے سامنے دیکھا، لمبی میز پر سڑے گلے اخبار مردہ جسموں کی طرح ڈھیر تھے۔ اس نے دل میں کہا، کیسی عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے پڑھائی عام ہو رہی ہے لوگ پڑھنے سے عاجز آتے جا رہے ہیں۔

اس کے سامنے کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اس نے ایک کتاب کھولی، اب تک وہ کسی قاری کے نکاح میں نہ آئی تھی، بیچاری کنواری کتاب! اس نے کتاب کو الٹا پلٹا تو اس کے کرم خوردہ صفحات جھڑنے لگے۔ اس نے تاسف سے سوچا، جو کتاب

پڑھی نہ جائے اس کے پیٹ میں دیمک اپنا گھر بنالیتی ہے! پھر بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کتاب سے باتیں کرے، اس کی آواز سنے، وہ آواز جو اب تک کبھی نہیں سُنی تھی۔

پھر جو اس نے ایک بار اس کتاب کو ہاتھ لگایا تو اسی لمحے کسی کوئل کی سُریلی آواز تلوار کی مانند اس کے سینے میں اُتر گئی۔ اس نے پلٹ کے دیکھا، کوئل دریچے کے پار درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی تھی۔ ابھی وہ اسے ڈھونڈ نہ پایا تھا کہ ہوا کا ایک سرکش جھونکا تیزی سے اندر گھسا اور اس کے سامنے رکھی ہوئی کھلی کتاب کے اوراق اتنے زور سے پھڑپھڑائے کہ اسے بالکل یوں لگا جیسے کوئی پرندہ اڑنے کی کوشش کررہا ہو مگر ———

پھر جب دریچے کے باہر سڑک پر ایک موٹر زور سے ہارن بجاتی گزری تو کوئل کی آواز کا طلسم ٹوٹ سا گیا۔ وہ چند ثانیئے سڑک پر دوڑتے بھاگتے لوگوں کو دیکھتا رہا اور جب وہ دوبارہ لائبریری کے در و دیوار میں واپس آیا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اِرد گِرد کتابوں کی الماریوں میں محض اینٹیں سجی ہوں۔ اسے پہلی بار اپنے جاہل ہونے کا احساس ہوا۔ اب اسے اپنے کانوں پر شبہ تھا اور آنکھوں پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ بالآخر اس نے کتاب ایک طرف ہٹا دی اور خود کو یہ اطمینان دلانے لگا کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ ❖

تھیٹر ۷

کھیل شروع ہونے کو ہے۔

ہلکی ہلکی المیہ موسیقی کے ساتھ اسٹیج کے پردے کی جھریوں سے پس منظر کی نیم تاریکی جھانک رہی ہے۔ کبھی کبھی کوئی سایہ اسٹیج کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف رینگ جاتا ہے، جہاں پردے کے دونوں حصّے آپس میں بغلگیر ہوتے ہیں۔ ملگجی روشنی کی ایک لکیر باہر آرہی ہے۔ اس روشنی کا تعاقب کرتے ہوئے آنکھیں اسٹیج کے عقب میں بچھی ہوئی چارپائی پر پڑتی ہیں جس پر کسی عورت کا بے حس و حرکت جسم نیم تاریکی کی چادر میں لپٹا ہوا پڑا ہے۔ اس کی شکل صاف نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن کھلے ہوئے بال چارپائی سے نیچے لٹکتے نظر آرہے ہیں ——— عورت کے کھلے ہوئے بال، بے حس و حرکت جسم، 'اندھیرا' ——— لوگ کہتے ہیں کہ یہ عورت' اس کھیل کا مرکزی کردار ہے۔ یہ عورت کون ہے، کہاں رہتی ہے۔ اس کے ساتھ اور کون رہتا ہے، یہ سب باتیں مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی ہیں۔ یہ ایک ایسے گھر کی کہانی ہے جہاں یہ عورت ساری محبتوں کا مرکز ہے۔ اس گھر میں اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس عورت کی خوبصورتی بے مثال ہے، اس کی پیشانی پر اُبھرتے چاند کی جھلملاہٹ ہے اور رخساروں پر آنکھوں کو طراوت بخشنے والا فجر کا نور، اس کے مخروطی ہاتھوں کو دیکھئے تو اس پر گندم کے سُنہری خوشوں کا گمان گزرتا ہے اور اس کی سانسوں سے دھان کی بالیوں کی خوشبو آتی ہے۔ اس عورت کے کئی بچے ہیں، ایک لڑکا کسان ہے، دوسرا لوہار اور تیسرا اسکول ماسٹر،

اس کا ایک اور بیٹا کھیتوں کا رکھوالا ہے۔ یہ سب لڑکے اپنی خوبصورت ماں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ ماں کے دم سے گھر میں بہار ہے، وہ ٹوٹ کے محبت کرنے والی ہستی ہے اور اسے اپنے بچوں سے بہت لگاؤ ہے، وہ بہت محنتی اور جفاکش عورت ہے، وہ دودھ، دہی بلوتی ہے، چرخہ کاتتی ہے اور رات دن اپنے بچوں کی خدمت میں لگی رہتی ہے۔ کسان جب کھیتوں پر جاتا ہے تو وہ اس کے لئے لسی اور روٹی کا انتظام کرتی ہے اس کے علاوہ اسے ماسٹر کے کپڑوں کی بھی فکر رہتی ہے، لوہار کی بھٹی کے روشن ہونے کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور کھیتوں کے رکھوالے کے آہنی موٹھ والے لٹھ کو بھی سنوارنا اور چمکانا ہوتا ہے۔ پہلے منظر میں کسان سامنے آتا ہے جو اپنے کھیتوں میں ہل چلا کر بیلوں کو پانی پلا رہا ہے اتنے میں ایک شخص اس کے پاس آتا ہے وہ ایک سفید گھوڑے پر سوار ہے جس پر طلائی ساز جھلملا رہا ہے اور رکابیں چاندی کی ہیں۔ اجنبی نے خوب اونچا سا مخملیں ٹوپ اوڑھ رکھا ہے جس میں سرخ پھول اڑسا ہوا ہے۔

"اچھا تو میرے دوست تم کسان ہو؟" اجنبی پوچھتا ہے۔

کسان اجنبی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا ہے اور بیلوں کی گردنیں تھپکتا ہے جو اجنبی کو دیکھ کر بدک گئے ہیں۔

"تم کون ہو؟ میں نے یہاں تمہیں پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

اجنبی مسکراتا ہے۔ "میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری مدد کو آیا ہوں!"

کسان حیران ہو کے پوچھتا ہے ——— "کیسی مدد ———؟"

اجنبی ہنستا ہے ——— "ارے مدد نہیں سمجھتے، بھئی میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں ——— مجھے تم غریب معلوم ہوتے ہو، میں چاہتا ہوں کہ تمہارے حالات اچھے ہو جائیں بولو تم ایک ایکڑ میں کتنی گندم اگاتے ہو؟"

کسان تنک کر کہتا ہے ۔۔۔ "یہی کوئی ۔۔۔۔ مگر تمہیں اس سے مطلب ؟"

"اوہو ۔۔۔" اجنبی کہتا ہے ۔۔ "یہی تو خرابی ہے کہ تم لوگوں کو بات سمجھانا مشکل ہے، ارے بھئی میں چاہتا ہوں کہ تمہاری پیداوار میں اضافہ ہو جائے ۔۔۔۔ کیوں ؟ کیا تم امیر ہونا پسند نہیں کرو گے ؟"

کسان بیلوں کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیتا ہے ۔۔۔۔ "ہونہہ مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں !"

اجنبی گھوڑے کو موڑ کے پاس جاتے ہوئے کہتا ہے ۔۔۔ "کوئی بات نہیں میں پھر آؤں گا، میں دوستوں کا دوست ہوں !"

گھر پہنچ کے کسان اپنی ماں کو بتاتا ہے ۔۔۔۔ "ماں آج ایک اجنبی مجھے ملا تھا، کہتا تھا تم امیر ہونا پسند کرو گے ؟"

"کیا ۔۔۔۔ ماں فکر مند ہو کے کہتی ہے، کون تھا وہ، دیکھو بیٹا تم اپنے کام سے کام رکھو، کسی کی باتوں میں نہ آنا !"

اگلے منظر میں لوہار نظروں کے سامنے آتا ہے جو اپنی بھٹی کے آگے بیٹھا تندہی سے لوہا کوٹ رہا ہے، اچانک وہی گھوڑ سوار آتا ہے اس کے گھوڑے کی نعل نکل گئی ہے ۔۔۔۔ "بھائی لوہار ذرا میرے گھوڑے کی نعل لگا دو ۔۔۔۔" وہ کہتا ہے ۔ لوہار آنکھ اٹھا کے اجنبی کو دیکھتا ہے جو اپنے گھوڑے کی لگامیں پکڑے اس کی دوکان کے آگے کھڑا ہے ۔ اجنبی کا مخملیں ٹوپ اور گھوڑے کا طلائی زیور اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے ۔ لوہار ہاتھ روک کے پوچھتا ہے ۔۔۔۔ "تم کون ہو بھائی، مسافر لگتے ہو، کہیں دور سے آرہے ہو ؟"

اجنبی خوش دلی سے گھوڑے کے منہ پر ہاتھ پھیر کے کہتا ہے ۔ "اپنا دوست سمجھو اور ذرا

جلدی سے میرے گھوڑے کی نعل ——!

"ابھی لیجیے، سرکار" لوہار گھوڑے کو نئی نعل لگاتے ہوئے کہتا ہے۔ "مہمانوں کی خدمت تو ہمارا فرض ہے۔ آپ نے بڑا کرم کیا جو ——!"

اجنبی جیب سے ایک طلائی سکہ نکال کے اس کے ہاتھ پر رکھتا ہے —— "یہ لو میرے بھائی تمہارا محنتانہ —— تم بہت اچھے آدمی ہو!"

"سونے کا سکہ ——!" لوہار پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ہتھیلی پر جگ مگ کرتی اشرفی کو دیکھتا ہے۔ "مہربان میں آپ کو ایسے نہ جانے دوں گا!" وہ کہتا ہے۔ "آپ میرے ساتھ روٹی کھائیں، جو بھی روکھی سوکھی ——!"

اجنبی مسکراتا ہے —— "اچھا تم کہتے ہو تو کوئی حرج نہیں ورنہ مجھے ابھی بھوک نہیں تھی!"

لوہار جلدی جلدی روٹی کی پوٹلی کھول کے اجنبی کے سامنے رکھ دیتا ہے۔

"نوش فرمائیے سرکار، اصلی جو کی روٹی اور نمکین لسّی!"

اجنبی جلدی جلدی چند لقمے توڑتا ہے، پھر اٹھتے ہوئے کہتا ہے —— "بس بھئی تمہارا بہت بہت شکریہ، اب میں چلا" پھر چونک کے کہتا ہے: "اچھا ہاں، وہ گھوڑے کی زین سے ایک ریشمی تھیلی اتارتا ہے، "لو بھئی ——" وہ خوش دلی سے کہتا ہے "یہ تم رکھ لو، میں تو تمہارا سارا کھانا چٹ کر گیا!"

لوہار تھیلی کھولتا ہے اندر سے گھی میں تر تراتی ہوئی خستہ شیرمالیں نکلتی ہیں جن پر کباب دھرے ہیں۔ "یہ کیا ——؟" لوہار حیران ہو کے کہتا ہے۔

کچھ نہیں —— اجنبی کہتا ہے، "یہ تمہارا حصہ ہے!"

لوہار ممنونیت کے احساس سے سرشار ہو کے کہتا ہے ـــــ "جناب کا بہت بہت شکریہ ـــ آپ پھر آئیں گے نا؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، میں ضرور آؤں گا بلکہ آتا رہوں گا ـــــ" پھر وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کے کہتا ہے ـــــ "میرا خیال ہے کہ تمہارا کاروبار خوب ـــــ!"

لوہار کہتا ہے ـــــ "بس جناب ــ روکھی پھیکی گذر بسر ہو جاتی ہے، ورنہ ہم کیا اور ہمارا کاروبار کیا، ہم تو چھوٹے لوگ ہیں، غریب لوگ ـــــ!"

گھوڑ سوار کہتا ہے ـــــ "میری مانو تو کچھ اور سلسلہ کرو ـــــ کوئی اور کاروبار، تجارت!"

"مثلاً ـــــ" گھوڑ سوار اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر اس کی نگاہیں لوہار کے سر پر جم جاتی ہیں، لوہار نے پھولدار چادر کا صافہ باندھ رکھا ہے ـــ "یہ چادر کیسی ہے، بڑی خوبصورت ہے!"

"جی ہاں سرکار ـــــ" لوہار کہتا ہے ـــــ "یہ تو میری ماں کی اوڑھنی ہے، میری ماں ہے نا سرکار وہ بہت اچھی اوڑھنیاں رنگتی ہے پھر اس میں نئے نئے گل بوٹے کاڑھتی ہے ـ ذرا غور سے دیکھیں کیسے کمال کی تدبیر ہے، اس کی شفاف نیلاہٹ میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے آزاد پرندے ـــــ کبوتر اور فاختائیں ـــــ اس کے ہاتھ میں بڑا ہنر ہے جی ـــــ میں کیا بتاؤں، اب دیکھئے یہ چادر آپ کو پسند آئی ہے، کتنی خوبصورت ہے!"

"خوبصورت ـــــ" گھوڑ سوار مسحور ہو کے کہتا ہے ـــــ "بہت خوبصورت، بھلا جو اتنی خوبصورت چادریں بناتے ہیں وہ خود کتنے خوبصورت ہوں گے، تمہاری ماں یقیناً خود بھی!"

لوہار فخر سے کہتا ہے ـــــ "میری ماں سرکار ـــــ وہ تو بستی کی سب سے خوبصورت

عورت ہے ۔۔۔!"

گھوڑ سوار کہتا ہے ۔۔۔ "بلا شبہ ۔۔۔ مجھے یقین ہے، سنو، میری بات مانو"
وہ لوہار کے صلافے کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے "تم تو اس سے ہزاروں روپے کما سکتے ہو'
اپنی دُنیا بدل سکتے ہو ۔۔۔ بس اپنی ماں کو راضی کرو پھر تو تمہارے وارے نیارے ہیں'
۔۔۔ تمہیں جتنی اشرفیاں چاہئیں مجھ سے لے لینا اور روز شیر مال ۔۔۔!"
"مگر ۔۔۔ لوہار کہتا ہے ۔۔۔ بھلا کہیں ماں یہ بات مانے گی اور میرے بھائی"؟
اجنبی کہتا ہے ۔۔۔ "وہ کیوں نہیں مانیں گے؟ کیا انہیں تمہارا امیر ہونا پسند نہیں، ہاں
سچ ہے۔ سب خود غرض ہو گئے ہیں ۔۔۔ مگر سنو جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ۔!
لوہار حیران ہو کے پوچھتا ہے ۔۔۔ "یعنی کیا مطلب ۔۔۔؟"
اجنبی کہتا ہے ۔۔۔ "مطلب یہ کہ دولت کس کو پسند نہیں، میری مانو تو تم یہ موقع
ہاتھ سے نہ جانے دو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم گھاٹے میں نہیں رہو گے ۔۔۔!"
اگلے منظر میں لوہار اپنی ماں کو سارا قصہ سُناتے ہوئے پوچھتا ہے ۔۔۔ "وہ حیرت
ہے، ماں بھلا وہ کون شخص تھا جو گھوڑے کی نعل جڑنے کی اُجرت ایک اشرفی دیتا ہے
اور اس کے تھیلے میں شیر مالیں جھک رہی ہیں؟"
کسان کہتا ہے ۔۔۔ "وہ یقیناً یہ کوئی بھلا مانس ہے جو سچ مچ میں ہماری مدد کرنا چاہتا ہے'
بہت کام کا آدمی لگتا ہے!
لوہار کہتا ہے ۔۔۔ "وہ اور ماں تیری اوڑھنی کے تو بڑے دام لگ رہے ہیں بول کیا تو
نہیں چاہتی کہ ہمارے دن پھر جائیں"؟
ماں یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو جاتی ہے ۔۔۔ "وہ اچھا تو اب میری اوڑھنی کا سودا کرے

گا، لعنت ہو تیری شکل پر، تجھے شرم نہیں آئی یہ بات کہتے ہوئے، چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرا!"

ماں لوہار کے سر سے صافہ جھپٹ لیتی ہے۔

"مگر ماں ___؟" کسان کہتا ہے۔

"سوچنے کی بات یہ ہے ___!" ماسٹر کہتا ہے۔

پھر سب تھوتھنیاں لٹکائے باہر چلے جاتے ہیں۔

پھر اسکول ماسٹر سامنے آتا ہے۔ وہ بچوں کو پڑھا کے اسکول کی بوسیدہ عمارت سے نکل رہا ہے کہ اس کی ملاقات گھوڑ سوار سے ہوتی ہے جس کا سفید گھوڑا لگتا ہے کہ برف سے ترشا ہوا ہے ___ "آہا میرے دوست کیا تم مدرسے سے نکل رہے ہو، بچوں کو پڑھا کے!"

"ہاں جی ___!" اسکول ماسٹر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے گھوڑ سوار کی طرف دیکھتا ہے۔

"مگر آپ کون ہیں اور آپ نے مجھے کیسے پہچانا ___؟"

اجنبی کہتا ہے ___ "بھئی کمال کرتے ہو، یہ تو چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ کون علم کی دیوی کا پرستار ہے۔ تمہاری کھوئی کھوئی آنکھیں علم کے حصول کیلئے تمہارے تجسس کا پتہ دیتی ہیں!"

ماسٹر خوش ہو کے کہتا ہے ___ "اچھا جی، اور آپ کون ہیں بھلا؟"

"میں ___" گھوڑ سوار کہتا ہے ___ "میں کوئی بھی ہوں میرا نام جان کے تمہیں بھلا کیا حاصل ہوگا یہ سمجھو کہ خیر خواہ ہوں تمہارا ___ اچھا تو تم بچوں کو درس دے کر آ رہے ہو؟"

ماسٹر کہتا ہے ___ "ہاں جی بس، ابھی ابھی اسکول ختم ہوا ہے!"

گھوڑ سوار پوچھتا ہے ـــــ "کیا پڑھاتے ہو؟"

"میں ـــــ ماسٹر کہتا ہے ـــــ میں بچّوں کو جغرافیہ پڑھاتا ہوں، یہ زمین، پہاڑ، دریا، جھیلیں، کھیت اور کھلیان!"

گھوڑ سوار کہتا ہے ـــــ "اچھا، خوب بہت خوب ـــــ تو تمہیں سب کچھ پتہ ہے کہ پہاڑ کے آگے اور پہاڑ کے پیچھے کیا ہے؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کے دوسری طرف بھی نیلی جھیلیں ہیں جن میں کنول کے قرمزی کٹورے تیرتے ہیں ـــــ کبھی ادھر گئے ہو؟"

"نہیں ـــــ ماسٹر کہتا ہے ـــــ اس کی آنکھوں میں تجسّس کے دیئے جل رہے ہیں ـــــ اور کیا ہے اُس طرف؟"

گھوڑ سوار کہتا ہے ـــــ "ان نیلی جھیلوں کے کنارے خوبصورت بستیاں ہیں جن میں پری چہرہ لوگ رہتے ہیں۔ وہاں درختوں کے پتے خزاں میں بھی نہیں جھڑتے اور ان کی زمرّدی شاخوں پر طلائی چونچ والی فاختائیں سُریلی تانیں اڑاتی رہتی ہیں ـــــ!"

"سچ ـــــ؟ ماسٹر کی آنکھیں جیسے ان دیکھی دُنیا کے سفر پر نکل کھڑی ہوتی ہیں۔

"بالکل سچ ـــــ گھوڑ سوار کہتا ہے "کبھی تم میرے ساتھ چلنا، میں تمہیں ایسی دنیا میں لے چلوں گا جو تم نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوگی!"

اس کے بعد اگلا منظر ہے جس میں ماسٹر اپنی ماں سے کہتا ہے ـــــ "ماں اب یہاں میرا جی نہیں لگتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے انوکھے دیس میں جہاں... !"

اب کسان پھر نظروں کے سامنے آتا ہے وہ کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے مُڑ مُڑ کے بستی سے آنے والی پگڈنڈی کو دیکھ رہا ہے جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ ذرا دیر میں سامنے گھوڑ سوار آتا دکھائی دیتا ہے۔ کسان بیلوں کو ہانکتا مرے پرے جاتا ہے۔

گھوڑسوار قریب آ کے گھوڑے سے اُتر جاتا ہے۔ سورج کی روشنی میں گھوڑے کے سونے اور چاندی کے زیورات جھلملا رہے ہیں۔

"ہاں دوست۔ گھوڑسوار خوش دلی سے کہتا ہے۔ کہو اچھے تو ہو، کیسے حال چال ہیں؟"

کسان بیلوں کو چمکارتا ہے ـــــ "تم نے میرے بھائی کو گھوڑے کی نعل لگانے پر اشرفی دی تھی؟"

اجنبی مسکراتا ہے ـــــ "ہاں ہاں بہت اچھا آدمی ہے وہ ـــــ تم بھی اچھے آدمی ہو ـــــ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں!"

اجنبی گھوڑے کی پشت سے چرمی تھیلا اتارتا ہے۔ "یہ لو ـــــ!" اجنبی تھیلا کسان کو دیتا ہے۔ "اس میں خوشحالی کے بیج ہیں، جب تم ان بیجوں کو اپنی زمین میں بوؤ گے تو تمہاری پیداوار پہلے سے دُگنی تگنی ہو جائے گی، سمجھے، پھر تم خوب امیر ہو جاؤ گے!"

"اچھا ـــــ؟" کسان اجنبی کو حیرت سے دیکھتا ہے ـــــ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ ـــــ اجنبی کہتا ہے۔ یہ تھیلا تمہارا ہے، یہ ختم ہو جائے تو مجھ سے اور لے لینا مگر ایک بات کہوں، یہ بیلوں کی جوڑی مجھے دے دو، تم ان کا کیا کرو گے، یہ بوڑھے بیل ـــــ ویسے بھی اب تمہیں اتنی محنت کی ضرورت نہیں ـــــ!"

کسان ہچکچاتا ہے ـــــ "مگر یہ تو میرے بڑوں کی نشانی ہیں ـــــ!"

اجنبی کہتا ہے ـــــ "لیکن بالکل بے کار، دقیانوسی ـــــ تمہیں ان کی کیا ضرورت ہے، تم ان کے بغیر بھی خوشحال ہو سکتے ہو!"

"ٹھیک ہے ـــــ!" کسان تھیلا لے کر بیلوں کی جوڑی اجنبی کے حوالے کر دیتا ہے اور

خود خوش خوش گھر کی جانب چل دیتا ہے۔

اگلے منظر میں کھیتوں کا رکھوالا سامنے آتا ہے جو کھیتوں کا چکر لگا کے چھپر کے نیچے آگ تاپ رہا ہے اتنے میں دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں آتی ہیں پھر اندھیرے کے بطن سے سفید گھوڑے کی روشنی طلوع ہوتی ہے اور مخملیں ٹوپ والا اجنبی اس کے پاس آتا ہے۔

"کون ہے ــــ ؟" رکھوالا اپنا لٹھ اٹھاتا ہے۔ اجنبی قریب آ کے گھوڑے سے اُتر جاتا ہے

"ارے بھئی رکھوالے، میں ایک مسافر ہوں ذرا آگ تاپنے نہ دو گے، بہت سردی ہے!"

رکھوالا اپنا لٹھ پیچھے ہٹاتا ہے ــــ "اچھا مسافر ہو، تو آجاؤ ــــ بیٹھو، ٹھہرو ذرا آگ تیز کر دوں!"

وہ جلتی آگ میں خشک ٹہنیاں جھونکتا ہے۔ اجنبی ہاتھ تاپتے ہوئے کہتا ہے "تو تم کھیتوں کے رکھوالے ہو، یار بڑی سخت ڈیوٹی ہے تمہاری بھی، دن کو چین نہ رات کو ــــ کیا تمہارا گھر بار نہیں؟"

"گھر بار ہے جبھی تو رکھوالی کر رہا ہوں۔" رکھوالا کہتا ہے۔

گھوڑ سوار کہتا ہے ــــ "لیکن کبھی کبھی آرام تو کر لیا کرو!"

رکھوالا کہتا ہے ــــ "ڈیوٹی جو پوری کرنی ہوتی، ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے نا؟"

کمال ہے بھئی ــــ" اجنبی کہتا ہے، میں نے تمہیں کبھی پلک جھپکتے نہیں دیکھا!"

"پلک کیسے جھپکتے ہیں ——؟ رکھوالا حیرت سے پوچھتا ہے، مجھے تو بزرگوں نے یہی بتایا تھا کہ رکھوالے کبھی پلک نہیں جھپکتے!"

"اچھا —— اجنبی کہتا ہے، مگر یہ جو تمہارا لٹھ ہے نا! بالکل بے کار چیز ہے، یہ کسی کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ایسا کرو یہ لٹھ مجھے دے دو میں اس کے بدلے تمہیں بندوق دیتا ہوں، بالکل نئی بندوق ——!"

"بندوق ——؟" رکھوالا تعجب سے اجنبی کو دیکھتا ہے۔

"ہاں بندوق —— اور جتنے کارتوسوں کی ضرورت ہو وہ بھی مجھ سے لے لینا، میرے پاس ان کی کوئی کمی نہیں ——!" گھوڑ سوار لٹھ اٹھا لیتا ہے اور بندوق رکھوالے کو تھما دیتا ہے۔

"سنو —— اجنبی کہتا ہے —— اب تم سو رہو ——!"

"مگر ڈیوٹی ——؟" رکھوالا پوچھتا ہے۔

"پھر بھی ڈیوٹی —— اجنبی کہتا ہے —— تمہارے پاس بندوق ہے اور پھر میں بھی تمہارے آس پاس موجود ہوں، پھر کس کی مجال ہے جو ادھر کا رُخ کرے! تم ذرا فکر نہ کرو!"

پھر رکھوالا سفید گھوڑے کو اندھیرے کی سیاہ جھیل میں برف کی ڈلی کی طرح گھلتے دیکھتا ہے اور سرد ہوا اس کے بدن میں گدگدیاں کرتی ہے۔ وہ جمائیاں لیتا ہے۔

اور اب جو منظر سامنے آتا ہے اس میں تمام گھر والے موجود ہیں۔

بھرا پرا گھر!

لیکن ـــــ

کسان اپنے خزانوں کی فصل کاٹ رہا ہے اور اس کے تکیئے کے نیچے خوشحالی کے بیجوں کا تھیلا دبا ہوا ہے۔

رکھوالا کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھے منہ پڑا ہے اور اس کی بندوق اس کے پیٹ کے نیچے دفن ہے۔

ماسٹر اُن دیکھی بستیوں کے خواب میں گم ہے۔

لوہار کے نتھنوں میں خستہ شیر مالوں کی میٹھی میٹھی خوشبو گدگدیاں کر رہی ہے۔

اور پچھلا دروازہ ـــــ

اور لیجئے اب یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ کھیل شروع ہونے والا ہے۔ میں سرگوشیوں اور آہٹوں کی چادر سے سر باہر نکال کے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ سب لوگ دم بخود بیٹھے ہیں۔

پردہ اٹھتا ہے۔

#

ہانکا

شیر آیا شیر

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بھوک سے بلبلاتی شام نے بستی کو یوں ہڑپ کر لیا جیسے چھپکلی پتنگے کو نگل جاتی ہے۔

مکانوں کے چھجوں سے اداسی کی پیلی برف جھالروں کی طرح لٹک رہی تھی اور گھروں کے دروازے بند تھے۔ لوگ سرِ شام ہی بستروں میں دبک گئے تھے البتہ اس بڑھیا کے گھر سے متواتر رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں جس کے بیٹے کو شیر اٹھا لے گیا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا — "حیرت ہے کہ شیر اچانک بستی میں گھس آتا ہے اور کوئی اسے دیکھتا نہیں، ویسے تو یہ بستی بہادروں کے لئے مشہور ہے مگر حیرت ہے کہ پھر بھی —؟"

ایک شخص آگے بڑھا اور بولا — "یہ شیر نہیں ضرور کوئی بلا ہے، ایک تو آج تک اسے کسی نے دیکھا نہیں، یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ شیر ہے کہ بھیڑیا یا کوئی اور عفریت؟ دوسرے یہ کہ جس وقت وہ بستی میں داخل ہوتا ہے موسم اتنا خوفناک ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جائیں۔ نجانے کہاں سے بادل گھر گھر کے آ جاتے ہیں اور زبردست گرج چمک ہونے لگتی ہے"!

دوسرا شخص بولا — "اسی سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت بھی اس کے ساتھ ہے، ضرور یہ ہمارے گزشتہ گناہوں کا عذاب ہے"!

ایک نوجوان نے اس آدمی کو حقارت سے دیکھا اور بگڑ کے بولا — "عذاب رات کے اندھیرے

میں نہیں آتا ۔ اسے چھپ کے آنے کی ضرورت نہیں!"

میں نے بندوق کو اپنے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا ــــ "حیرت ہے کہ جب شیر بستی میں آتا ہے تو کوئی ایک آدمی بھی اسے نہیں روک سکتا، آخر بندوقیں کس لئے ہوتی ہیں؟"

کسی نے جواب دیا ــــ "تھا وہ بے چارہ ، وہی شیر کی دھاڑیں سُن کر گھر سے نکلا تھا مگر شیر تو شیر ہوتا ہے جی اور پھر وہ جس کے منہ کو خون لگ چکا ہو، اور یہ آدم خور تو بہت ہی مکار قسم کی شے ہے!"

میں نے پوچھا کھوجیوں نے کچھ نہیں کیا ــــ "آخر وہ ہو گا تو یہیں آس پاس کے جنگل میں؟"

نوجوان بولا ــــ "کھوجی کیا کریں جناب، پتہ نہیں وہ اُڑ کے آتا ہے یا درختوں پر لٹک کے، زمین پر تو اس کے قدموں کے نشانات ملتے ہی نہیں!"

ایک شخص پیچھے کھڑا تھا، وہ بولا "اس کمبخت کی تو عادتیں بھی عجیب سی ہیں جی، وہ آدمیوں پر شوق سے حملہ آور ہوتا ہے مگر جانوروں سے اسے کوئی رغبت نہیں، بستی کے رستوں پر بے شمار گدھے، گھوڑے اور بیل آزاد گھومتے پھرتے ہیں مگر وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا!"

ایک آدمی نے کہا "ہم نے اس سے پہلے بھی ایک سے ایک خونخوار شیر دیکھے ہیں مگر یہ ان سب جانوروں سے مختلف ہے۔ ان شیروں کی جو انسانوں کے دشمن ہو جائیں بہت سی عادتیں مشترک ہوتی ہیں مثلاً انہیں کبھی سامنے سے وار کرنا پسند نہیں۔ انہیں مزا اسی میں آتا ہے کہ وہ اکیلے آدمی کو بے خبری میں آن دبوچیں۔ میں نے ایسے شیر بھی دیکھے ہیں جو باچھوں سے ٹپکتے خون کو بدن سے پونچھ کے اپنی پناہ گاہ میں ایسی مسکین صورت بنا کے بیٹھ جاتے ہیں جیسے کوئی گوتم بدھ، دن کے وقت عموماً یہ اعتکاف میں وقت کاٹتے ہیں یا مکھیوں سے مذاکرات میں، ان کی بہادری کا مظاہرہ عام طور پر رات کو ہوتا ہے!"

نوجوان بولا ——— "یہ شیر اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں عیاری ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ہے اور اس نے آج تک کسی کو اپنی طاقت کا اصل اندازہ نہیں ہونے دیا، خبر نہیں کہ اس کا قد و قامت کتنا ہے، سر کتنا بڑا ہے اور دھڑ کتنا ہے۔ اصلاً یہ شیر ہے کہ چیتا، اس کی نشانیاں کیا ہیں، اس کے بدن پر دھاریاں کتنی ہیں اور اگر دھاریاں ہیں تو ان کے کنارے پر کچھ دھبے بھی ہیں جو ستاروں کی طرح چمکتے ہیں، اس کی کھال کا رنگ کیسا ہے، اونٹ جیسا بھورا یا ہاتھی جیسا خاکستری؟"

میں نے کہا ——— "لیکن وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلتا تو ہوگا، کبھی جنگل میں چہل قدمی تو کرتا ہوگا، کبھی چشمے پر تو آتا ہوگا، ہر شیر کو اپنی تصویر دیکھنے کا شوق ہوتا ہے۔!"

لوگوں نے کہا ——— "شیر چشمے پر نہیں آتا اس کی نگرانی تو ہم نے بہت کی مگر شاید یہ ظالم پانی سے اپنی پیاس نہیں بجھاتا!"

میں نے کہا ——— "اچھا تو پھر سنو ہمیں جنگل کے اندر دور تک جانا ہوگا، اسے تلاش کرنے اور اس سے دو دو ہاتھ کرنے!

اب خاصا وقت گذر چکا تھا اور ہم دہشت کی سیاہ چادر اوڑھے بیٹھے تھے کسی نے کہا ——— "مگر جناب آپ کو پتہ نہیں، جنگل میں تو دن کے وقت اتنی تاریکی ہوتی ہے کہ قریب کی چیز نظر نہیں آتی اس وقت تو وہاں ———!"

نوجوان بولا —— "ہم اگر اب بھی نہ گئے تو جنگل ہمارے گھروں میں پوری طرح گھس آئے گا اور تب —— !"

میں نے کہا —— "ہاں ہمیں جانا ہوگا، مشعلیں ساتھ لے لو، جس کے گھر میں روشنی کرنے کی جو بھی کوئی چیز ہے ساتھ لے آئے !"

ہم جنگل میں جاتے ہیں

ہمارے آگے اور پیچھے

دائیں اور بائیں

بوڑھے درختوں کی لمبی داڑھیوں سے خوف کی چمگادڑیں لٹکی ہوئی ہیں۔ ہمارے قدموں کے نیچے سوکھے پتوں کی سسکیاں رینگتی ہیں۔

خاردار جھاڑیوں کے استخوانی ہاتھ ہمارے دامن کھینچتے ہیں۔

میرا ساتھی کہتا ہے —— "کس بلا کا اندھیرا ہے اور چپکے چپکے ہمیں دلدل کھا رہی ہے۔ !"

میں کہتا ہوں —— "فکر مت کرو، مشعلوں والے ہمارے پیچھے ہیں، ان کے ساتھ بانکے والے ہیں لیکن ابھی خاموشی سے بڑھتے جاؤ تاکہ تاریکی کی گود میں سویا ہوا جنگل ہمارے قدموں کی چاپ سے جاگ نہ اٹھے، چاند نکلنے تک ہمیں یوں ہی آگے بڑھتے جانا ہے —— !"

میرا ساتھی کہتا ہے، "پتہ نہیں کب چاند نکلے گا ؟"

میں اسے سہارا دیتا ہوں اور ہم کھائیاں پھلانگتے ہیں۔

درختوں کے ننگ دھڑنگ کالے بھتنے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے کھڑے ہیں اور ہمیں دیکھ کے خوفناک انداز سے مسکراتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں —— تو وہ شیر ——

میرا ساتھی اچانک سرگوشی کرتا ہے ــــــ "آپ نے کچھ سنا، جنگل درد سے کراہ رہا ہے اور ہوا کے مُردہ ہاتھ ہمارے گلوں کو ٹٹولتے ہیں۔"

ہم بڑھتے جاتے ہیں۔

پھر ایک جگہ

ایک اونچی پہاڑی کے قریب

میرا ساتھی مجھے روکتا ہے "آپ کو کچھ محسوس ہوا۔"

اس مقام پر آسمان توے کی طرح اوندھا ہو گیا ہے اور فضا میں اڑتی ہوئی راکھ کی سی تپش ہے۔

بیڑوں کے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو سانپوں کی پھنکاریں چاٹتی ہیں۔

میرا ساتھی کہتا ہے، آپ نے سنا کوئی زور زور سے خراٹے لے رہا ہے!

ہم پہاڑی پر چڑھتے ہیں۔

خراٹے بھڑوں کی طرح ہمارے جسموں سے چمٹ جاتے ہیں۔

ہمیں دور اندھیرے میں کچھ چنگاریاں سی اڑتی نظر آتی ہیں۔

میں کہتا ہوں، دیکھو یہ رہا اس کا مسکن،

اونچی پہاڑی کے گہرے غار میں شیر سو رہا ہے اور اس کے نتھنوں سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔

ہم غار کے سامنے اونچے درختوں پر اپنی نشست جما لیتے ہیں۔ بندوقوں پر ہماری گرفت مضبوط ہے اور ہم آنے والے لمحوں کا انتظار کرتے ہیں، جب چاند نکلے گا اور ــــــ

پھر چاند نکلتا ہے

میری نگاہیں غار کے دہانے پر جمی ہوئی ہیں جہاں سے بار بار غراہٹوں کے سانپ پھنکارتے ہیں۔ اتنے میں سیاہ جٹاؤں والا ایک ملنگ پیڑ اپنی کالی آستین سے چاند کو اس طرح ہوا میں اچھال دیتا ہے جیسے کوئی جواری سکہ اچھالے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھیکی چاندنی سارے منظر کو نگل لیتی ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے سارا جنگل مارے خوف کے سفید ہو گیا ہو۔

عین اُسی وقت

دور ڈھول پر تھاپ پڑتی ہے۔

میں اپنے ساتھی سے کہتا ہوں، لو بھئی وہ لوگ آ رہے ہیں!

ڈھول کی پہلی تھاپ کے جواب میں شیر زور سے دھاڑتا ہے اور پہاڑ سے پتھر نیچے کی طرف لڑھکتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں، غار کے دہانے پر مجھے شیر کا سر نظر آتا ہے، بڑا سا ہیبت ناک سر!

میں سوچتا ہوں، اب وہ باہر آئے گا اپنی نیند اچٹنے کا انتقام لینے!

ہم اپنی بندوقیں سیدھی کرتے ہیں۔

شیر تیزی سے باہر کی طرف لپکتا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی ہوئی دہشت کی سیاہ چیل ہمارے اوپر جھپٹتی ہے۔

میرا ساتھی کہتا ہے ——— خدایا اتنا بڑا شیر ———!

شیر ایک بار تن کے کھڑا ہوتا ہے تو میں دیکھتا ہوں، اس کا قد ہاتھی کے برابر تو ضرور ہو گا۔ ایک نظر میں وہ مجھے ہاتھی لگتا ہے اور جب وہ اپنا سر اوپر کی طرف اٹھاتا ہے تو مجھے اس کی آنکھوں میں بغض اور کینے کے الاؤ بھڑکتے نظر آتے ہیں۔ اس کے نتھنوں سے

آگ بہہ رہی ہے۔

وہ اپنا منہ اوپر اٹھا کے زور سے گرجتا ہے پھر جست لگانے کے لئے اپنے بدن کو تولتا ہے اچانک ڈھول پر تھاپ بہت قریب سے سنائی دیتی ہے۔ پھر ہانکا شروع ہو جاتا ہے اور شور کی لہر اتنی تیزی سے آگے بڑھتی ہے جیسے آوازوں کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ ڈھول بج رہے ہیں اور کنستر پیٹے جا رہے ہیں اور لوگ چلاتے ہوئے پہاڑی پر چڑھ رہے ہیں ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں اور لالٹینیں، بہت سوں کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں اور نیزے اور بندوقیں۔

میں دیکھتا ہوں۔ شیر اچانک ٹھٹک کر نیچے سے آتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہے جو نیم دائرے کی صورت میں اس طرح آگے بڑھ رہے ہیں جیسے زمین کے بطن سے ہلال طلوع ہو رہا ہو۔

شیر ہڑبڑا کے جست لگاتا ہے اسی لمحے ڈھول پر ایکبار پھر زور کی تھاپ پڑتی ہے اور لوگ للکارتے ہیں اور ——————

اور میں دیکھتا ہوں کہ شیر اچانک سکڑنے لگتا ہے جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل جائے۔ ایک بار وہ مجھے کتے کے برابر نظر آتا ہے، دوسری جست میں مجھے خرگوش کے برابر دکھائی دیتا ہے اور پھر ہانکے کے امڈتے ہوئے شور میں جب میں آخری بار ادھر نظر کرتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان ایک وحشت زدہ چوہا اپنی جان بچانے کو ادھر ادھر دوڑتا پھرتا ہے۔

میں سامنے دیکھتا ہوں۔ بہت سارے لوگ ڈھول بجاتے ہوئے، نیزے اور تلواریں ہلاتے ہوئے اوپر چڑھ رہے ہیں۔ نیم دائرے کی صورت میں درجنوں سورج فضا میں تیرتے ہوئے اوپر آ رہے ہیں اور ان کی روشنی سے سارا جنگل چمک اٹھا ہے اور درختوں کے ہاتھ برچھیوں کی طرح اور ڈھاک کے پتے ڈھالوں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ایک پتلے دبلے درخت کی

بل کھائی ہوئی شاخ پر چاند ایسے ٹکا ہوا ہے جیسے شیش ناگ نے من اگل دیا ہو۔
میں اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھتا ہوں، ادھر میں ہوں، میں دوسری طرف دیکھتا ہوں ادھر بھی میں ہوں۔ میں سامنے دیکھتا ہوں، ہر طرف میں ہوں اور پھر میں خوشی خوشی اس طرف چل دیتا ہوں جہاں میری ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں اور ان پر پھول اُگ رہے ہیں۔

⌗

اُنگلیاں

سوا نیزے پر کئی سُورج چمک رہے تھے اور سفید میز پر زخمی شخص گھڑی کے کل پرزوں کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ پٹیوں سے اس کا چہرہ تقریباً ڈھکا ہوا تھا اس پر سرجن جھکے ہوئے تھے اور سفید پوش نرسیں انہیں، آنکھوں کو خیرہ کرتے، چمکتے دمکتے آلاتِ جراحی تھما رہی تھیں۔ زخمی کے بازو اور ناک میں نلکیاں لگی ہوئی تھیں اور خون دیا جا رہا تھا۔

وہ آگے بڑھا، پروفیسر نے سفید ماسک کے اوپر چمکتی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اسے دیکھا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر زخمی کی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی کلائی میں ٹانکے لگا رہا تھا جس کے سرے پر ہاتھ کا پھول کھلتا ہے لیکن اب وہاں صرف آدھی خون آلود ہتھیلی نظر آ رہی تھی۔

پروفیسر نے کہا ــــــ "ڈاکٹر اس کیس میں نئے سرجنوں کے لئے بہترین درس ہے، اسے تمہیں خاص طور پر دیکھنا چاہیئے!"

اس نے پروفیسر کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا: "کوئی پیچیدہ کیس ہے سر؟"

پروفیسر نے جواب دیا ــــــ ہاں اس شخص کے سر اور پسلیوں میں شدید چوٹیں ہیں اور دایاں ہاتھ اس طرح ٹوٹ پھوٹ گیا ہے کہ ساری انگلیاں ضائع ہو گئیں۔

پروفیسر دوبارہ میز پر جھک گیا۔ اس کی انگلیاں کمالِ مہارت سے زخموں کو سی رہی تھیں

وہ خاموشی کے ساتھ اُسے کام میں مصروف دیکھتا رہا۔ آپریشن تھیٹر کی خاموشی میں آلاتِ جراحی کی ہلکی پھلکی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک منظر زخمی شخص کی کلائی سے لٹکتے ہوئے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا اور سوچا، شاید یہ شخص ٹھیک ہو جائے اور اس کی جان بچ جائے مگر انگلیاں ؟ جو ہاتھ کی پہچان ہوتی ہیں ان سے تو ہاتھ کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ انگلیاں جن کی سب کو ضرورت ہوتی ہے اور جو ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہیں۔ اسے یاد آیا جب وہ چھوٹا تھا اور اپنے گھر کے پائیں باغ میں پودوں کی پتیاں نوچتا پھرتا تھا تو مالی بابا اسے سمجھاتا،

"نہ بیٹے پتیاں نہیں نوچتے!"

"کیوں بابا ؟" وہ پوچھتا۔

"پتیاں تو ان کی انگلیاں ہیں بیٹے جن سے یہ پودے دھوپ کے دامن سے اپنے لئے رنگ چنتے ہیں!"

رنگ ـــــ اس نے سوچا ـــــ جو حنا بن کے ہتھیلیوں میں آفتاب اور آنکھوں میں تارے چمکاتا ہے!

پروفیسر نے نرس سے کہا ـــــ مریض کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے، آکسیجن لگا دو! میز پر لیٹے ہوئے شخص کی کھلی ہوئی انگلیاں ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں اُبھر آئیں۔ اچانک اُسے اپنی انگلیوں میں کلبلاہٹ محسوس ہوئی، اُسے جھرجھری سی آ گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔ ہاتھ دستانے میں چھپا ہوا تھا۔ ہاتھ کی لکیریں بھی چھپی ہوئی تھیں۔ عمر کی لکیر، قسمت کی لکیر، ستارے، جزیرے اور اُبھار، نصیب، ترقی، جدوجہد، کامیابی، زندگی کا ورق، ایک مختصر سے ہاتھ میں کیا کیا چھپا ہوتا ہے۔ اس نے سوچا، ہاتھ، زندگی کا مطلق العنان حاکم، جس کے سر پر انگلیوں کا سنہرا تاج جھلملاتا ہے۔ عجیب سے تصور سے اس کی آنکھیں مُندسی گئیں۔

پھر دو سفید ہاتھ کبوتروں کی طرح پَر پھڑپھڑاتے اس کے پاس سے گذرے، حرارت سے بھرپور لمبی لمبی انگلیاں ریشمیں رومال ہلاتی نظر آئیں۔ اس نے کئی گداز انگلیوں کو اپنے بالوں میں تیرتے محسوس کیا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو انگلیاں اس کے ہاتھ میں آگئیں۔ وہ نرم و نازک ریشمیں انگلیاں، اُس نے انہیں گنگناتے سُنا۔ اس نے کہا، جادو تمہاری انگلیوں میں جادو ہے، ان میں جگانے کی صلاحیت ہے اور سُلانے کی بھی۔ جب تم میرے بالوں کو چھوتی ہو تو میری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں جیسے میں دُنیا کی ہر چیز سے منہ پھیر رہا ہوں لیکن جب تم انہیں انگلیوں سے ستار چھیڑتی ہو تو یوں لگتا ہے کہ ایک نئی دُنیا پیدا ہو رہی ہے۔ آواز کی جھنکاریوں میں غسل کر کے یہ وحشی، اُداس اور اکتائی ہوئی کائنات جیسے انگڑائی لے کے جاگ اُٹھتی ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ مغل طرزِ مصوّری میں انگلیوں کی مخروطی ساخت جس کے سبب ہاتھ کنول کے ادھ کھلے پھولوں کا عکس معلوم ہوتے ہیں بالکل وہی ہے جو تمہاری انگلیوں کی ہے۔

جادو یہ سُن کے ہنسنے لگی۔ "ہو سکتا ہے، ویسے مجھے یقین تھا کہ تم ایسی ہی باتیں کرتے رہو گے، تم جو خطرناک حد تک تصوّر پرست، شاعر، فلسفی اور نجانے کیا بلا ہو!" اس نے کہا۔

"نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں اور سچ کہتا رہوں گا، میرا مقصد تمہاری جھوٹی تعریف نہیں بلکہ تمہاری صلاحیت کا سچا اعتراف ہے۔ میں حق پرست ہوں، بی بی ــــــ تمہاری انگلیوں کے کنول میں روشنی ہے، تمہاری انگلیاں تو چہکتی ہیں۔ باتیں کرتی ہیں!"

جادو نے کہا ــــــ "جھوٹ، کہیں انگلیاں بھی باتیں کرتی ہیں۔ وہ تو چپ رہتی ہیں!"

ہاں یہ سچ تو ہے، اس نے سوچا، بہت سی انگلیاں بولتی نہیں، سوچتی ہیں، اشارے کرتی ہیں۔ پھر اسے وہ شخص یاد آیا جسے وہ بازار سے گذرتے ہوئے، فٹ پاتھ پر چاک سے تصویریں بناتے دیکھتا تھا۔ طویل سرمئی سلیٹ پر رقص کرتے، سفید چمکیلے نقوش جو ہاتھ اٹھا کے گزرنے

والوں کو پکارتے تھے۔ کسی دن وہاں ان کی ملاقات قدیم رومنوں کے آہن پوش گلیڈیئیٹرز (GLADIATORS) سے ہوتی جو رزمگاہ میں غلاموں کے سرنگوں جسموں سے اپنی خون آشام تلواروں کی پیاس بجھاتے نظر آتے۔ کبھی سفید رنگ کے دیو ہیکر گدھوں کی قطاریں چوپنچ کھول کے راہگیروں کے تعاقب میں لپکتیں اور کبھی یہاں سے وہاں تک گلاب کھلے ہونے جن پر اُجلے پروں والی تتلیاں دائروں میں چکر کاٹتیں۔ اس شخص کی انگلیوں کے پوروں سے تو چہروں اور تصویروں کا دریا نکلتا تھا۔ اس کے گرد ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ وہ لوگوں کے اعضائے بدن پر نت نئی تصویریں بنانے میں کمال رکھتا تھا، سُورج، بادبان، سفینے، کیوپڈ اور گلاب۔

ٹیٹو کے شائق لوگ اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر باریک سوئیوں سے اپنی پسند کی تصویریں کھدواتے، نام لکھواتے اور مسکراتے ہوئے اپنی راہ لیتے۔ وہ تو مسکراہٹیں بیچتا تھا۔ خود اس کی کلائی پر شہنائی کی تصویر کُھدی ہوئی تھی۔ ایک دن کسی نے پوچھا ـــــ آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟

"فائدہ ـــــ وہ ایک آدمی کے ہاتھ پر تتلی کا پھول کاڑھتا ہوا بولا ـــــ جناب آپ شاید مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس پُرشور تعفن زدہ دُنیا میں لوگ خوشیوں کے قحط سے مر رہے ہیں اور میں انہیں تھوڑا سا خوش دیکھنے کی آرزو میں اپنی انگلیاں چلا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید لوگوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹیں واپس آسکیں۔ بس یہی اس کا فائدہ ہے!"

پروفیسر نے کہا ـــــ "دل کی دھڑکنیں معمول کے مطابق نہیں، خون کی نلکیاں ٹھیک کرو!"

اس کی نظریں پھر آپریشن ٹیبل پر مرکوز ہوگئیں۔ پروفیسر کی پیشانی پر پسینے کے قطرے

چمک رہے تھے اور اس کی سبک رفتار انگلیاں زخمی شخص کی زندگی کی ڈور سلجھا رہی تھیں۔

ایک بار پھر جادو نے اس کے کان میں سرگوشی کی ——— "میں بھی شاید ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی انگلیوں سے زندہ رہتے ہیں۔"

اس نے کہا ——— "میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ تمہاری انگلیوں کا کنول سدا بہار ہے!"

جادو ہنسی، "اچھا تو کیا تمہیں یہ سن کے خوشی ہو گی کہ اب یہ کنول ٹائپ رائٹر پر کھلے گا۔ سنو، میں نے ستار سیکھنا چھوڑ دیا ہے اور ملازمت کر لی ہے!"

"کیا کہا؟ ارے تم نے یہ کیا غضب کیا؟" وہ سٹپٹا کے بولا۔

مجھے پتہ تھا، جادو نے کہا۔ تم اسے پسند نہیں کرو گے لیکن ہمارے حالات ——— !"

اس نے کہا ——— "مگر تم نے عجلت سے کام لیا، مجھے تمہاری ذمے داریاں بٹانے میں خوشی ہوتی جادو ——— تم نے ذرا انتظار کیا ہوتا۔ دیکھو صرف دو سال کی بات ہے اور پھر ——— !"

"مجھے پتہ ہے ——— جادو نے کہا۔ پھر تم ڈاکٹر بن جاؤ گے اور تمہارے گھر میں سب سے پرانی آواز ہمارے خلاف فیصلہ دے گی!"

اس نے کہا، ایسا نہیں ہو سکتا، تم وقت آنے پر دیکھ لینا!

اور پھر جب وقت آیا تو اس کے گھر میں بھڑوں کا چھتہ ٹوٹ گیا اور مکڑی کے جالوں سے گرجدار آواز ابھری، اس سے کہو پہلے اپنی ملازمت ترک کر دے، وہ فضول سی ملازمت،

اس نے کہا ——— "جادو تمہاری انگلیاں ٹائپ کے لئے نہیں بنیں۔ تم ذرا ان کی آواز سنو ان سے تو موسیقی کے شگوفے چٹکتے ہیں، تم نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے!"

جادو نے سرد آہ بھری۔ "بدن کے دیس میں انگلیاں عوام الناس کی طرح جیتی ہیں اگر

دلیں کو زندہ رکھنا ہے تو حالات کے مطابق انہیں بھی معروف اور متحرک رہنا پڑے گا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں جیتے رہنے کے احساس سے عاری ہو جاؤں؟ میری بہت سی ذمے داریاں ہیں، بہت سی خواہشیں ہیں!"

اس نے کہا ــــــ "میں سمجھتا ہوں، تمہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پسند ہے۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے لیکن ــــ!"

جادو نے کہا ــــ "لیکن تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ میری انگلیاں کیا چاہتی ہیں، مونس یہ ہر دم متحرک رہنا چاہتی ہیں، کسی تعمیر، کسی ترتیب میں مصروف ــــ یہ میری محنت کش سہیلیاں!"

وہ بولی ــــ "مجھے پہلی بار ان کی پکار اس وقت سنائی دی جب میرے گھر کے سامنے اچانک ایک عمارت نے زمین کی تہوں سے اپنا سر اُبھارنا شروع کیا۔ میں نے سوچا، مٹی میں اتنی قوت نہیں کہ آپ ہی آپ جیتی جاگتی صورتوں میں ڈھل سکے لیکن عمارت اونچی ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ستونوں اور چھجوں پر بہت سے ہاتھ اور بہت سی مٹی میں لتھڑی ہوئی انگلیاں متحرک نظر آتی تھیں۔ میری انگلیوں نے کہا ذرا یہ معجزہ بھی دیکھو! یہ واقعی ایسا معجزہ تھا جس نے میرے دل میں اعتماد کا کنول کھلایا۔ لیکن افسوس ابھی عمارت زیرِ تعمیر تھی کہ ایک دن وہ زوردار دھماکے کیساتھ ڈھے گئی اور سنگریزوں کے ڈھیر میں ہاتھوں اور انگلیوں کا ملبہ بھی شامل تھا۔ پتہ ہے ایسا کیوں ہوا اس لئے کہ ہاتھوں کو دھوکا دیا گیا تھا اور انہیں ریت تھما دی گئی تھی۔ میں بھی اپنی انگلیوں سے اعتماد کی عمارت تعمیر کر رہی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ وہ کبھی دھوکا کھائیں۔ یہ عمارت تو میری خواہش، میرا خواب ہے ــ!"

اس نے کہا ــــ "تم ٹھیک کہتی ہو، ہر شخص چپکے ہی چپکے اپنے اندر عمارت تعمیر کرتا ہے ــــ میں بھی ــــ لیکن اگر کچھ لوگوں کو ــــ؟"

جادو نے کہا "میں تمہارے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ دوست لیکن اگر میری مکمل شخصیت تمہارے لئے قابلِ قبول نہیں تو .... !"

یکایک پروفیسر کے ہاتھ سے قینچی چھوٹ گئی اور اس کے میز پر گرنے سے قدرے زور کی جھنکار ہوئی۔ پروفیسر نے کہا، ہڈیاں جُڑنے کی اُمید ذرا کم ہے، اگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو شاید کہنی سے نیچے سارا ہاتھ کاٹنا پڑے ــــــ !

زخمی کا پٹیوں میں لپٹا ہوا سراپا کفن پوش لگ رہا تھا۔ اس نے قدرے تاسف سے کہا۔ "یہ تو زخموں سے چور ہے آخر اسے ہوا کیا ــــــ ؟"

پروفیسر بولا۔ شاید کوئی فساد، ہنگامہ، فری فار آل (FREE FOR ALL) مولوٹوو کاک ٹیل یا پھر کوئی دستی بم ــــــ کچھ بھی ہو سکتا ہے !

اس نے دل میں کہا ــــــ اس بیچارے نے تو بس آگ دیوتا کی گرج ہی سُنی ہوگی۔ بھلا اسے اپنے بدن کے ٹکڑے نکلتے کہاں دیکھا ہوگا۔ ؟

پروفیسر تشویش سے بولا ــــــ خون بہت بہہ چکا تھا لیکن آپریشن ضروری تھا !" اُسی وقت زخمی نے بیہوشی کے عالم میں ہچکی لی اور اس کی باچھوں سے خون بہہ نکلا۔ پروفیسر اس کی طرف لپکا۔ نرسیں گھبرا کے جلدی جلدی خون کی نالیاں ٹھیک کرنے لگیں۔ پروفیسر نے آکسیجن ماسک درست کیا اور زخمی کے سینے کو ٹٹولا۔ دل کی حرکت ریکارڈ کرنے والے آلے سے زندگی کی مدھم ہوتی ہوئی لے سنائی دے رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زخمی کا سر ایک طرف جھک گیا اور وہ ہاتھ نیچے لٹک گیا جس سے خون کی نلکیوں کے سانپ لپٹے ہوئے تھے اس نے دیکھا، اس شخص کی عریاں کلائی پر شہنائی کی تصویر کھدی ہوئی تھی۔ اسی لمحے اس نے ایک بے نام سی آگہی کو اپنے سینے میں اُترتے محسوس کیا۔ معاً اسے جادو کی آواز سنائی

دی۔ ”بیچاری حسّاس انگلیاں۔ سنو مجھے ایسی زندگی قبول نہیں جس میں انگلیوں کی خوشیاں شامل نہ ہوں۔“

پھر وہ جانے کے لئے مُڑا اور اس نے کہیں دُور کسی عمارت کے گرنے کی آواز سُنی۔

دیواریں

سب دیواریں ایک جیسی ہوتی ہیں سخت، پتھریلی اور نامہربان! ان کی چمک بھی ایسی ناگوار ہوتی ہے جیسے کسی مُردے کی ٹھہری ہوئی آنکھ کی سفیدی ــــــ لیکن مجھے تعجّب ہے کہ اس کے باوجود وہ دیواریں مجھے ہر بار اپنی جانب بُلاتی محسوس ہوتیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ ان کے قریب جا کے ایسی خوشی کا احساس ہوتا تھا جو صرف دوستوں کے چہرے دیکھ کے ہوتی ہے، مَیں روز دیکھتا تھا کہ ان دیواروں کی رفاقت میں میرا راستہ آسانی سے کٹ جاتا۔ یہ دیواریں میرے قدم سے قدم ملا کے دُور تک چلتی رہتیں۔ تنہائی آدمی کو اداس کر دیتی ہے، لیکن یہ دیواریں مجھے کبھی تنہا نہ ہونے دیتیں اُن کی پُرسکوت سرگوشی اور منجمد گویائی مجھے کبھی اداس نہ ہونے دیتی ان دیواروں کا رنگ نجانے کیا تھا خیر ان کا جو بھی رنگ ہو وہ یوں بھی نظر نہ آسکتا تھا کہ اُن پر دُور تک لفظوں کے قافلے پھیلے ہوئے تھے۔ کالے، پیلے نیلے اور لال حروف ایک دوسرے کی باہنوں میں لٹکتے ہوئے، چمکدار روشنائی میں ڈوبے ہوئے نقش، روغنی چہرے اور اُبھرے ہوئے خطوط ــــــ

ایسا لگتا تھا جیسے پوری دیوار چمکیلے لفظوں سے بنی ہو، بہت سے جملے اور بہت سے لفظ اور بہت سے حرف ــــــ ان کے نقوش ایک دوسرے میں

گڈمڈ ہو گئے تھے۔

جب دیواریں پیچھے رہ جاتیں تو مجھے لگتا کہ جیسے میں آوازوں سے گونجتے گنبدوں سے نکل کے سناٹے کی طویل حکمرانی میں آ گیا ہوں۔ گھر کی بنیادوں میں سناٹا۔ ٹھنڈا دبیز سناٹا۔ ۔۔۔۔۔۔ سرد ہوتی ہوئی چائے کی پیالی پر دم توڑتی بھاپ ۔۔۔۔۔۔ کتابوں میں سوکھے ہوئے پھولوں کی پتیاں ۔۔۔۔۔۔ عینک کے دھندلائے ہوئے ٹھنڈے شیشے، ہر شے پر خاموشی مسلط تھی۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سا رقعہ کسی خزاں زدہ پتے کی طرح میرے سامنے آ گرتا! "اگر کتابوں سے پیٹ نہ بھر گیا ہو تو کھانا کھا لیجئے!" پھر ہم دونوں یعنی میں اور وہ جو میری رفیقۂ حیات تھی، کھانے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ کے اس احتیاط سے نوالے توڑتے کہ ہمارے درمیان خود رو گھاس کی طرح لمحہ لمحہ بڑھتی ہوئی خاموشی کی دیوار کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ کبھی اکتا کر میں ننھے سے کاغذی قاصد کو دوڑاتا۔ "اس ہفتے کے دوران یہ ہمارا چوتھا چپ کا روزہ ہے۔ خاتون ۔۔۔۔۔۔ آپ کی شیریں زبانی کے طفیل افطار کی کب توقع رکھوں ۔۔۔۔۔۔؟"

جواب آتا ۔۔۔۔۔۔ "ہم میں کوئی چیز مشترک نہیں سرتاج بہادر ۔۔۔۔۔۔ سوائے خاموشی کے ۔۔۔۔۔۔ سو اس سرمائے کو کیوں نہ سنبھال کے رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس جنم میں آپ کو اپنے دفتر، اپنے دوستوں اور اپنی کتابوں سے فرصت نہیں ملے گی اور میں پڑھائی میں ہمیشہ سے کمزور رہی ہوں خدا حافظ اور شب بخیر ۔۔۔۔۔۔ صبح ناشتے پر ملاقات ہو گی۔"

میں کہنا چاہتا ۔۔۔۔۔۔ مگر سنو تو سہی کیوں نہ ہم لوگ ایک دوسرے کو آئینہ دکھا کے اپنے دل صاف کر لیں، کیوں نہ ہم اپنے وجود کی مٹی سے اذیتوں اور ناپسندیدگیوں

کے کنکر چُن ڈالیں تاکہ محبّت اور مفاہمت کی فصل پھل پھول سکے! لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی تنہائیوں کے قلعے میں محصوُر ہو جاتی جس کے دروازے پر سنّاٹے کی سرد میخیں جڑی ہوئی تھیں۔

گھر سے باہر بھی سنّاٹے کی زنجیر میرے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی چلتی۔ عرصے سے مجھے خاموشی کی تنی ہوئی ڈور پر تنہا چلنا پڑ رہا تھا۔ مجھے راستے میں مصافحے کے لئے پھیلے ہوئے گونگے ہاتھوں کی لمبی چوڑی فصل بھی کاٹنی پڑتی اور لوگ اپنے ہاتھوں میں خاموشی کے دستانے چڑھائے بے دلی سے ایک دوسرے سے ملتے اور بچھڑتے جاتے اور ان کے ہونٹوں پر پڑی برف میں جمی ہوئی مسکراہٹ تحریر ہوتی جس کا کچھ مطلب نہیں ہوتا۔

جب میری نظر دیوار کے اس سرے پر پڑتی جہاں موٹے موٹے لفظوں میں لکھا ہوا تھا۔ سچائی آپ کو پکارتی ہے! تو مجھے بے تحاشہ اس کی یاد آتی جو اپنی سچائی سے پریشان تھا۔ اسے چُپ رہنے کی عادت نہ تھی۔ بات بات میں بولنا اور ذرا ذرا سے معاملے میں ٹوکنا اس کی فطرت میں شامل تھا یہ ایسا کیوں ہے، ویسا کیوں نہیں ہے، یہ ایسے ہونا چاہیئے، وہ ایسے ہوتا تو ٹھیک تھا۔ یوں کرو، یوں نہ کرو۔ پیچھے ہٹو، آگے بڑھو۔ یہ اچھا ہے، وہ بُرا ہے۔ ہر شے کے بارے میں وہ اپنی رائے رکھنے کا عادی تھا اور وہ علی الاعلان اس کا اظہار بھی ضروری خیال کرتا تھا۔

میں کبھی سمجھاتا ——— یہ مصلحت کا تقاضا نہیں۔ وہ چیخ کر کہتا ——— مصلحت پر سچ سے بہتر نہیں دوست، سچ بولنا سیکھو۔ سچ بولنے سے آدمی بہادر ہو جاتا ہے۔

وہ بہت بہادر آدمی تھا۔ ہمیشہ سچ ہی بولتا تھا مجھے اب اس کی کتنی یاد آتی ہے۔

مگر افسوس کہ اب تو عرصے سے اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ نجانے کہاں چلا گیا وہ؟ میں نے اس کی تلاش میں کہاں کہاں کے چکر نہ لگائے کہاں کہاں نہ گیا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا لوگوں کے ہجوم میں اِدھر اُدھر، اسے ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ تو کہیں ملتا ہی نہیں بھری پُری سڑکوں پر چلتے ہوئے اکثر میں لوگوں کے چہروں کو بغور دیکھتا ہوں کہ شاید ان میں سے کسی چہرے میں اس کی شباہت محسوس ہو مگر اس جیسا کوئی منظر نہیں آتا ـــــ وہ چہرہ تو جیسے اب ناپید ہو گیا ہے۔ وہ لَو دیتی ہوئی پیشانی، دمکتے ہوتے رخسار ـــــ اور چہرے تو یوں لگتا ہے جیسے مٹی کے بنے ہوں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ ان چہروں کی مٹی تو ایسی ہے کہ جس میں شادابی کا ذرا نام ونشان نہیں ـــــ بالکل بھٹس اور بے جان! جب کہ یہ دیوار ایسی چکتی ہوئی مٹی سے بنی ہے کہ اس پر کھنچا ہوا ہر خط بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ گمان گزرتا ہے کہ جیسے دیوار سانس لے رہی ہو۔ پتہ نہیں دیوار کا دھڑکتا ہے یا اس پر لکھے ہوئے لفظ سانس لیتے ہیں مجھے یقین ہے کہ لفظ بھی سانس لیتے ہیں میں سوچتا ہوں اگر ان لفظوں میں جان نہ ہوتی تو زندہ رہنا کتنا مشکل ہو جاتا ان زندہ لفظوں کی حرارت پا کے میں بار بار برف کے گھر سے زندہ سلامت نکل آتا ہوں۔

ایسے ہی برف کے ایک جزیرے میں جسے میں دفتر کہتا ہوں۔ ایک شخص ہے جسے دیوتاؤں نے میرا نگران مقرر کیا ہے ویسے وہ مجھے خود بھی کسی دیوتا سے کم نہیں لگتا۔ اس کی شخصیت کی شاندار عمارت پر ہر وقت مسکراہٹ کا سائن بورڈ آویزاں رہتا ہے اور آنکھوں کی محرابوں میں خوش خلقی کے دیئے جھلملاتے رہتے ہیں اور بیشک ہم دونوں ایک دوسرے پر خلوص کے پھول نچھاور کرنے اکٹھے ہوتے ہیں۔

”کہیئے جناب ـــــ خیریت؟“

"جی شکریہ ——— آپ فرمایئے؟"

"صاحب فلاں کام نہیں ہو سکا!"

"اچھا ———!"

"صاحب کل کی چھٹی چاہیئے!"

"کوئی بات نہیں!"

"صاحب اس وقت دن نہیں رات ہے!"

"ٹھیک کہتے ہو!"

لیکن ابھی میں کچھ ہی دُور جاتا ہوں کہ اُوپر سے میرے لئے کاغذی تھیلیاں نازل ہونا شروع ہو جاتی ہیں جن میں کنکھجورے بند ہیں۔

"فلاں کام کیوں نہیں ہوا جواب دیں۔"

کل کی چھٹی منظور نہیں کی جا سکتی۔"

"اس وقت رات نہیں دن ہے تم اپنی آنکھوں کا معائنہ کراؤ اور دیکھو اجازت لے کے جانا۔"

"فلاں مسئلے پر اب تک تم نے کیا عملی قدم اٹھایا تفصیل سے روشنی ڈالو؟"

"بتاؤ فلاں گستاخی اور دفتری قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونے کے سبب کیوں نہ تمہارے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے؟"

مجھے ایسے میں یوں لگتا ہے کہ جیسے میں لمحوں کے گلیشیئروں تلے دفن ہوتا جا رہا ہوں اور برف میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے گرد ایک سفید تابوت تراش رہی ہے کبھی کبھی میں برف کے اس تابوت میں سے سر نکال کے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں لیکن

دُور دُور تک خاموشی کے کیکٹس پر آواز کا کوئی پھُول کھلتا دکھائی نہیں دیتا ایسے ہی ایک برفیلے لمحے میں، مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک مانوس سا شخص اپنے شانوں پر مٹی کا گھڑا رکھے چپ چاپ میرے سامنے سے گزرتا ہے۔

میں کہتا ہوں ـــــ ارے یہ مجھ سے منہ پھیر کے کیوں جا رہا ہے یہ شخص۔ میرا دوست۔ میرا بھائی ـــــ!

کوئی کہتا ہے ـــــ تم نے دیکھا نہیں اس گھڑے میں بہت سی چھپکلیاں بند ہیں اور ہر چھپکلی کے گلے میں تمہارے نام کا تعویذ لٹک رہا ہے وہ اب تم سے بات تھوڑی کرے گا!

کیوں ـــــ مگر کیوں ـــــ؟ میں احتجاج کرتا ہوں۔

اس لئے کہ تم نے اسے ناراض کیا ہے اس کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

میں کہتا ہوں ـــــ تو وہ کس انتظار میں ہے آخر وہ میرے سر پر اپنا چھپکلیوں سے بھرا ہوا گھڑا کیوں نہیں اُلٹ دیتا! میں کیوں آواز کے قحط سے مر رہا ہوں؟

اور میں ایک بار پھر سکوت کے برفیلے صحرا میں آواز کے صبا رفتار پرندے کے تعاقب میں نکلتا ہوں۔ اس برف زار کے آخری سرے پر وہی دیوار ہے جس پر لفظوں کے قافلے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دیوار کا اعجاز یہ ہے کہ اسے چھُو کے میرے کو اس کی دُنیا کچھ دیر کو اُڑتے پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سے گونج اٹھتی ہے اور میرے شانوں پر سے نیلگوں سناٹے کی چادر سرک جاتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ آج میرے شانے سنّاٹے کی وزنی چادر کے بوجھ سے آزاد نہیں ہوتے اور کسی پرندے کے اُڑنے کی صدا سنائی نہیں دیتی۔ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے وہ دیوار اپنی جگہ پر نظر نہیں آتی۔ اس دیوار کے ساتھ ہی وہ گونجتے

لفظ، وہ شناسا سا حروف، وہ میرے محبوب چہرے اور میرے غمگسار بھی جو مجھے دیکھ کر دُور سے خوشدلی، گرمجوشی اور محبت سے ہاتھ ہلاتے تھے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ برف زار کے آگے بھی برف زار ہے اور اس کا کوئی سِرا، کوئی کنارہ نہیں۔ میں غور کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ پُرانی دیوار کو ڈھا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ سیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے ستونوں کے سہارے خاردار تاروں کی باڑ لگائی جا رہی ہے۔ میں سر جھکائے ہوئے آگے بڑھتا ہوں خاردار تاروں کے پیچھے ایک پتھریلی عمارت ہے جس کے سامنے ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا ہے۔

• گونگوں اور بہروں کی اقامت گاہ!

❖

سادھ بیلا میں اجنبی

اب سے پہلے یہ جگہ اس کے لئے کتنی اجنبی تھی کتنی نئی لیکن ذرا دیر میں وہ اس سے اس طرح مانوس ہو گیا جیسے وہ یہاں پہلی بار نہ آیا ہو بلکہ عرصۂ دراز تک باہر رہنے کے بعد گھر واپس لوٹا ہو۔ اسے فضا میں ایک ایسی مانوس سی خوشبو رچی بسی محسوس ہوئی جو قریبی عزیزوں کے بدن میں ہوتی ہے۔ اس نے کینوس پر موقلم چلاتے ہوئے سوچا، فرش پر لگی ہوئی سنگِ مرمر کی ان چٹخی ہوئی سِلوں کو دیکھو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان پران محبوب لوگوں کے قدموں کے نشان ہیں کہ جن کو اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔ محبوب قدموں کے یہ نشان مرمریں ہلالیوں سے گذر کے کائی لگی سیڑھیوں سے گہرے پانی میں اُتر گئے تھے اور گدلے پانیوں والا پُرشور دریائے مہران برسہا برس سے ان نشانوں کو اپنی محبت بھری زبان سے چومتا، چاٹتا ہوا بہہ رہا تھا۔ صبح جب اس نے ڈگمگاتی، ڈولتی کشتی سے سادھ بیلا کی پانی میں ڈوبی ہوئی مرمریں سیڑھی پر قدم رکھا تو وہ چند لمحوں کے لئے اس عظیم الشان مندر کی عمارت کو دیکھ کے دم بخود رہ گیا۔ سادھ بیلا کی خوبصورت مرمریں عمارت ایک بڑے دخانی جہاز کی صورت نہایت پُرشکوہ انداز میں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ دریا کے نیلے پانی پر سورج کا کنول کھلا ہوا تھا، اور عمارت کے بالائی حصے پر دھوپ کی خاموش پیشقدمی جاری تھی۔ ابھی وہ سادھ بیلا کے حسن کو پوری طرح اپنی آنکھوں میں جذب نہ کر پایا تھا کہ ملاح نے اس کا سامان کشتی سے اُتار

کے عمارت کے بڑے دروازے کے سامنے آم اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ میں رکھ دیا۔
ایزل، کینوس کے رول، تھرموس فلاسک، دُوربین، موقلموں کا تھیلا، چھتری، ملاح نے ایک
نظر سامان کو دیکھا اور کہا ــــ لیجئے سائیں یہ رہا آپ کا سامان، اب میں چلتا ہوں ــــ!
وہ چونک گیا، اچھا ٹھیک ہے، شام کو مجھے لینے آجانا، سُورج ڈوبنے سے پہلے!
ملاح نے اثبات میں سر ہلایا اور سیڑھیوں کی طرف مُڑ گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سادھ بیلا کی
پُرسکوت خوبصورتی کو صبحِ صادق کے سحر انگیز اُجالے کی طرح اپنی رُوح کے نہاں خانے
میں اُترتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔ اس کا استغراق اس وقت ٹوٹا جب اس کے پیچھے خشک پتوں
کے فرش پر کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، زعفرانی کپڑوں میں ملبوس
مندر کا پجاری ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ لئے کھڑا تھا۔ پجاری نے ہاتھ جوڑ کے اسے
پرنام کیا، آیئے آیئے مہاراج، میں یہاں آپ کا سواگت کرنے کو موجود ہوں، بڑی خوشی
کی بات ہے کہ آپ آئے، بھگوان کی کرپا سے مجھے آپ کی سیوا کا موقع تو ملا ورنہ جب سے
وہ گئے ہیں ادھر کوئی نہیں آتا!
اس نے کہا ــــ میں بڑی دُور سے آیا ہوں، مجھے یہاں آنے کی بڑی آرزو تھی،
واقعی یہ جگہ میرے خوابوں کی بڑی خوبصورت تعبیر ہے، میں اسے اپنے فن کے ہاتھوں مزید
حسین بناؤں گا۔ یہ کینوس کا تھیلا دیکھ رہے ہو اس میں میرے دل کی دھڑکنیں بند ہیں، میرے
موقلم، میری آرزوئیں! اس نے موقلم کی نوک سے رنگوں کے چمکیلے افق کو کینوس پر پھیلتے ہوئے
دیکھا جس پر سادھ بیلا کی البیلی پرچھائیاں اُبھر رہی تھیں۔ پجاری نے کہا ــــ آیئے مہاراج
میں آپ کو اندر لے چلوں!
پھر وہ بڑے دروازے سے گذر کے اندر داخل ہوئے۔ عمارت بھائیں بھائیں

کر رہی تھی۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ خشک پتوں کے ڈھیر لگے تھے جن پر چلتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے گذرے دنوں اور بیتے لمحوں کو پیروں تلے روندا جا رہا ہو۔ پجاری نے کہا، مہاراج یہ سمے سمے کی بات ہے، اب یہاں کوئی نظر نہیں آتا کبھی یہاں سیوکوں کے ٹھٹ پہ ٹھٹ لگے رہتے تھے۔ مگر اب —— وہ طنزیہ سی ہنسی ہنسا —— اب تو شاید دیویاں اور دیوتا بھی اکیلے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں!

وہ دونوں مندر کے جگہ جگہ سے چٹخے ہوئے فرش پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ مندر کے وسیع کمرے میں لکڑی کی روغنی منقش چھت سے خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے لیکن ان پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اندر صندل مہک رہا تھا اور لوبان کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ مندر کی پھیلی ہوئی نیم تاریکی میں اسے بہت سے دیوتا اور دیویاں اپنی اپنی سوچ میں غرق نظر آئے، برہما، وشنو، شیو، ہنومان، گنیش —— ایک گوشے میں انہیں مندر کے بانی شری بنکٹ ڈی مہاراج ماتھے پر تلک سجائے تپسیا میں مصروف نظر آئے۔ ان کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں طمانیت کی روشنی تھی۔ وہ مندر سے نکل کے آم اور پیپل کے درختوں میں سے گذر رہے تھے کہ اُسے سرسبز پیڑوں کے بیچ میں ایک کٹیا نظر آئی۔ اس کے دروازے پر ایک کامنی سی لڑکی دریا کی طرف مُنہ کئے کھڑی تھی۔ قدموں کی چاپ سُن کے اس نے ان کی جانب مُڑ کے دیکھا۔ پجاری نے کہا —— یہ میری بیٹی سیتا ہے! سیتا نے دونوں ہاتھ جوڑ کے اسے سلام کیا۔

پجاری نے کہا —— یہ ہیں ہمارے مہمان!

اس نے ذرا غور سے سیتا کو دیکھا، اس کا چہرہ اسے کسی مذہبی کتاب کی طرح مقدس نظر آیا، اس کی آنکھوں میں ایسی پُرکشش چمک تھی کہ اس نے خود کو روشنیوں کی جھیل میں ڈوبتے

ہوئے محسوس کیا - وہ روشنیوں کی جھیل سے اُبھرا تو پجاری ایک دیوار میں گڑے ہوئے پتھر کے آئینے پر اُبھرے ہوئے نقوش کی جانب اشارہ کر کے کہہ رہا تھا ـــــ اور یہ ہے مَنش کے کرموں کا پھل ـــــ یہ سُورگ ہے اور یہ نرک ـــــ سُورگ میں کیسی سکھ چین کی بنسی بجتی ہے پر نرک ـــــ ہرے رام ذرا دیکھنا وہاں مَنش کے لئے کیسی کیسی کٹھنائیاں ہیں کیسے کیسے دُکھ ؟ اس نے دیکھا، ہیبت ناک خدوخال والی صورتیں کرب زدہ انسانوں پر مسلط تھیں۔

یہ دُنیا، یہ دُنیا بھی تو ایک نرک ہے، جہنم ـــــ اس نے بُرش چلاتے ہوئے سوچا، ہم سورگ سے کتنے دُور ہیں، ہم جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے - پہچان لو، انہیں پہچان لو، اس کے اندر سے کسی نے پکارا، رنگوں کی ایک لکیر اس کے وجُود میں سے اُبھری اور پورے کینوس پر چھا گئی، محبت کی تلاش میں تم کہاں تک جاؤ گے، تم کہاں سے آئے ہو، تم کون ہو، تم کیا چاہتے ہو ؟

پجاری دریا کے گھاٹ پر کھڑا تھا، دریا کی یہ لہریں جواب سادھ بیلا کی خشک، بوسیدہ اور شکستہ سیڑھیوں کو بہالے جانا چاہتی ہیں. کبھی یہی لہریں، ہاں یہی نرم و گرم شفیق لہریں یہاں چنچل نوجوان پجارنوں کی گداز پنڈلیوں کو چُومتے ہوئے ان کے اُجلے ہاتھوں سے گیندے کے زرد پھُول اُچک لیتیں ـــــ یہ لہریں ـــــ اور اسے انجن کی تیز سیٹی سُنائی دی، اس نے بُرش کو لمحے بھر کے لئے ہاتھ سے رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلٹ کے دیکھا، قینچی کے پُل پر سے ریل گذر رہی تھی، اس کی ہر کھڑکی سے لوگوں کی گردنیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آنیوالے لوگ ـــــ دریا کی ایک لہر آ کے زور سے سنگِ مرمر کے چبوترے سے ٹکرائی، شکستہ سیڑھیوں کا پلستر اکھڑ کے پانی کے ساتھ بہہ گیا ـــــ اس نے سگریٹ کا ایک کش لیا

اور پھر تصویر پر جُٹ گیا، رنگوں کے بادبان کھُل گئے۔ دُور آموں کے جھنڈ میں موروں کی ٹولی کھڑی تھی۔ پجاری نے کہا ـــــ یہ یہاں بس گئے ہیں۔ سیتا ان سے بہت خوش رہتی ہے، اور یہ سیتا پر جان چھڑکتے ہیں مگر پھر بھی سیتا کبھی کبھی رو دیتی ہے، بیچاری سیتا ـــــ!

کیوں؟ مگر کیوں؟

بُت ٹوٹ رہے ہیں نا، تم نے دیکھا، مندر کے بیرونی دروازے کے قریب ہنومان جی کا بُت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور وہ کرشن کی مورتی ـــــ تم نے دیکھا ہو گا ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی ہے اور ان کے ہونٹوں سے لگی ہوئی بانسری کالی ہو گئی ہے، افسوس ان کے ہونٹوں پہ بھی اب پہلے جیسی لالی نظر نہیں آتی، سیتا روتی ہے، میں اسے کیسے سمجھاؤں؟

اسے اپنے پیچھے پازیب کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی ہولے ہولے قریب آرہا ہو، اس نے مڑ کے دیکھا، اجرک کی چادر میں لپٹا ہوا نسوانی بدن ـــــ منتظر آنکھیں ـــــ

تم کون ہو؟ سیتا؟

میں ـــــ؟ چہرہ مسکرایا، ہاں میں سیتا ہوں، میں ستی ہوں، میں ماروی ہوں!

اس نے کہا ـــــ تم ماروی ہو، تعجب ہے تم ابھی تو سیتا تھیں اب ماروی کیسے ہو گئیں؟

چہرہ پھر مسکرایا، آنکھیں تبدیل ہو گئیں، میری صورت ایک ہے نام بہت سے ہیں! اس نے اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو غلام گردش میں ایک شخص نظر آیا جو عالمِ بیخودی میں چنگ بجاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

اس نے پوچھا ـــــ اور یہ شخص کون ہے؟

یہ بیجل ہے! آواز آئی۔ اس کے پیچھے بہت سے لوگ تھے ان میں ایک شخص شاہانہ

لباس پہنے ہتھیلی پہ اپنا سر رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ اس نے سوال کیا۔

یہ راجہ رائے ڈیا چ ہے جس نے بیجل کی موسیقی سے اپنے سر کا سودا کر لیا تھا!

تو تم سورٹھ ہو؟ اس نے سوال کیا۔

سورٹھ ہی سمجھ لو مگر میں نے کہا نا میں تمہارے لئے سب کچھ بن سکتی ہوں، چلو تم مجھے سیتا ہی سمجھو!

پھر جب اس نے سیتا کو نظر بھر کے دیکھنے کے لیے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ ہیولا غائب ہو گیا۔ سامنے پیلو کی شاخ پر ایک فاختہ بیٹھی اسے اپنی معصوم آنکھوں سے تک رہی تھی۔ اس نے برش نیچے رکھ کے کپڑے سے اپنی رنگوں سے لتھڑی ہوئی انگلیاں صاف کیں اور پھر سگریٹ کے بجھتے ہوئے ٹکڑے کو ہونٹوں کی گرفت سے آزاد کر کے دریا کی جانب اچھال دیا۔ جب وہ تصویر کی طرف پھر متوجہ ہوا تو پجاری کہہ رہا تھا۔ پجاریوں کے لئے مورتیوں کے ٹوٹنے نہ ٹوٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، سیتا یونہی روتی ہے، مورکھ اتنا نہیں جانتی کہ اصلی پجاری تو آتما کے پجاری ہوتے ہیں، فن کی اچھائی کو پوجتے ہیں، پتھروں کا کیا ہے ان کا ظاہری روپ تو بدلتا رہتا ہے، ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے، دیکھو تو پانی کی ہر لہر کے ساتھ کتنے پتھر بہہ جاتے ہیں!

مل تبدیلی پتھروں کا مقدر ہے اُسے کوئی نہیں روک سکتا! ——— اس نے کہا۔

اس نے سامنے دیکھا۔ دریا کی پتھریلی فصیل کے پرے سکھر شہر کا ہر گوشہ دھوپ کے سنہرے خیمے میں روشنی سے دمک رہا تھا۔ نئی تعمیر شدہ مسجدوں کے مینار، گنبد، برجیاں اور افق کے کناروں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی نئے کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں اسے میر معصوم شاہ کے مینار کی برسوں کی تنہائیاں دُور کرتی ہوئی نظر آئیں پھر کسی نے اسے پکارا، اس

نے مڑ کے دیکھا۔ سیتا نظریں جھکائے کھڑی تھی ـــــ میں تنہا تو نہیں ہوں؟

نہیں، اس نے جواب دیا، ہرگز نہیں، تم تنہا کیوں کر ہو سکتی ہو، دریا کی اتنی ساری لہریں، ہوا میں تیرتی ہوئی، پکی ہوئی کھجوروں کی مہک، اور تمہارے باغوں میں موروں کی ٹولی ـــــ تم اکیلی تو نہیں ہو!

سیتا نے کہا ـــــ مگر یہ بت ـــــ یہ بت جو ٹوٹ رہے ہیں، کرشن جی کی بنسی کیوں کالی پڑ گئی ہے؟ اس نے کہا ـــــ اگر یہ سارے بت ٹوٹ گئے تو مجھے ڈر ہے کہ میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی، مجھے اپنی تنہائی سے خوف آتا ہے، بولو کیا میں لنکا میں قید ہو جاؤں گی؟

اس نے کہا ـــــ نہیں میں تو اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ تمہیں تنہا نہ ہونے دوں اور میں تمہیں تنہا کیوں ہونے دوں گا جب کہ میں خود اپنی تنہائی دور کرنے یہاں آیا ہوں!۔

سیتا نے پوچھا ـــــ اور یہ بت؟

اس نے جواب دیا ـــــ میں ان بتوں کو توڑنے نہیں آیا، میں انہیں اپنے فن کے ہاتھوں سنوارنے آیا ہوں!

سیتا نے کہا ـــــ مندر کے دروازے پر تم نے دیکھا ہوگا کچھ لوگ مرمر کی سلیں اکھاڑ کے لے گئے ہیں اور یہ پاپ ٹھیک اس جگہ ہوا جہاں دیوار پر نرگ کی تصویر کھدی ہوئی ہے!

اس نے کہا ـــــ مگر اس سے مندر کی خوبصورتی میں تو کوئی فرق نہیں آیا خوبصورتی چاہے کسی صورت میں ہو چرائی نہیں جا سکتی، اس سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے اور جو لوگ اس سے محظوظ نہیں ہو سکتے وہ اصل میں خود پتھروں سے بہتر نہیں ہوتے!

سیتا نے کہا ـــــ تم بڑی اچھی باتیں کرتے ہو، مجھے تم پسند آئے کاش سب آنے والے

تمہاری طرح ہوتے تو کوئی بُت نہ ٹوٹتا، مجھے تنہائی کاٹنے کو نہ دوڑتی، موروں سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟

اس نے کہا ــــ میں تمہارے بُتوں کو ٹھیک کردوں گا، میرے موقلم اور میرے رنگوں پر بھروسہ کرو، میں کوشش کروں گا تو تمہارے کرشن کی بنسی پھر سے چمک اُٹھے گی اور ان کے لبوں کی مسکراہٹ ایک بار پھر جاگ اٹھے گی، میں نے کہا نا کہ میں تمہاری تنہائی دور کرنے آیا ہوں، میرے رنگ قبول کرو، یہ سب میرے مور ہیں!

سیتا نے کہا ــــ مگر تم چلے جاؤ گے!

اس نے کہا ــــ میں مسافر ضرور ہوں لیکن ہر مسافر کی ایک منزل ہوتی ہے، اگر پکی ہوئی کھجوروں کی مہک یونہی میرے گرد ناچتی رہے اور میری نگاہوں کے آسمان پر بہار کے رنگ پھیلتے جائیں تو میں یہیں رُک سکتا ہوں، یہی میری منزل، یہی میرا گھر ہے، بولو کیا میں رُک جاؤں؟

اجرک کے گھونگٹ میں سیتا کا چہرہ گلنار ہوگیا۔ اس نے اس کے بکھرے اور رنگوں میں لتھڑی ہوئی انگلیوں کو ایک نظر دیکھا پھر ایسے سانس لی جیسے کوئی غنچہ چٹکتا ہے اس کے بعد اس نے ہولے ہولے کہا ــــ میں ان ویران گھاٹوں پر آنے والوں کے انتظار میں تھک گئی ہوں، میری آنکھیں اپنے بیاروں کے دیس سے آنے والی کشتیوں کو یہاں لنگر انداز دیکھنے کی آرزو میں پتھرا گئی ہیں، اب تم آئے ہو، کاش تم یہاں ٹھہر سکو!

کیوں نہیں، اس نے اعتماد سے کہا، میں یہاں ٹھہروں گا!

سیتا نے اداسی سے بھرپور آواز میں کہا ــــ مگر اس کے لئے تمہیں وچن دینا ہوگا کہ تم مجھے کبھی چھوڑ کے نہیں جاؤ گے۔

اس نے کہا ـــــــ دھوپ کے اس سنہری آنچل کی قسم جو میرے اور تمہارے سروں پر پھیلا ہوا ہے اور اس دریائی ہوا کی سرد انگلیوں کی قسم جن کے محبت آمیز لمس نے مجھے ایک نئے لطف سے سرشار کیا ہے، مجھے یہ سودا منظور ہے، میں کوشش کروں گا کہ میرے تمام رنگ بہار کا نیا پیرہن بن کے سارے گل بوٹوں پر چھا جائیں، کرشن جی کی بنسی جاگ اٹھے، آم کے درختوں میں مور ناچتے رہیں اور پیلو کی شاخ ہری رہے، آؤ میرے نزدیک تو آؤ ـــــ!

جواب میں اس کے کانوں میں سیتا کی مترنم ہنسی گونجی ـــــــ میرے رام، میں تمہارے قریب ہی تو ہوں، میرے پتوں، میرے کھیت، میرے مہینوال!

اس نے تصویر سے سر اٹھا کے سامنے دیکھا تو پجاری نے کہا ـــــــ تم آپ ہی آپ کیا باتیں کرتے ہو اجنبی؟

اس نے کہا ـــــــ میں نے ابھی رنگوں کے غبار میں سسّی کو دیکھا تھا، ابھی ابھی تو ماروی یہیں کھڑی تھی، وہ پیاری پیاری کالی آنکھوں والی سوہنی!

اسی لمحے پکی ہوئی رس بھری کھجوروں کی مہک سے بسی ہوئی ہوا کے دوش پر موسیقی کی مدھر تانیں دریا کی سمت سے آئیں اور اس کے گرد پھیل گئیں۔ اس نے دیکھا ایک بڑی سی، میلے بادبان والی کشتی سامنے سے گزری، اس پر بہت سی لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اور کونے پر گھنی مونچھوں اور جھنجھرے کرتے والا ملنگ بیٹھا ہوا اکتارے پر شاہ لطیف کی کافی گا رہا تھا۔

اس نے دریا کی تند خو لہروں کو دیکھا جو ریتیلے کناروں کے خشک لبوں کو محبت کے پُرجوش، نم آلود بوسوں سے نواز رہی تھیں۔ اس کی نظروں کے عین سامنے قینچی کے پُل کے ایک آہنی پنجے میں بکھر کا قلعہ دبا ہوا تھا۔ دریا کی موجیں شکستہ قلعے کی فصیلوں کو روند

کے آگے بڑھ جانا چاہتی تھیں، دریا کی مٹیالی موجیں، جن کے وجود میں ہر دیس کی مٹی کا لمس بسا ہوا تھا، کوہساروں کی سُرخ مٹی، میدانوں کی زرد مٹی اور صحراؤں کی سرمئی مٹی، دریا ان تمام رنگوں کی مٹی کو اپنی مانگ کا سیندور بنائے شمال سے جنوب کی جانب دیرینہ مستقل مزاجی سے بہہ رہا تھا اور اب اس کی غصیلی موجیں بار بار قلعے کی فصیل سے ٹکرا رہی تھیں۔ ایک بار دریا کے وسط سے ایک تیز لہر اٹھی اور خشکی کے وسیع علاقے کو پار کرتی ہوئی بکھر کے قلعے کے شکستہ دروازے میں داخل ہو گئی۔ اس نے سوچا، آخر کار دریا نے فصیلوں کو شکست دے دی۔ شام ہو چکی تھی، سامنے شہر پر غبار سا چھا رہا تھا لیکن اس دھندلکے میں بھی میر معصوم شاہ کا منارہ اپنی تمام بزرگی اور وقار سمیت دُور سے نمایاں نظر آ رہا تھا اور نئی مسجدوں کے مینار پہریداروں کی طرح اسے اپنے حفاظتی گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔ قینچی کے پُل کے برابر میں نیا تعمیر شدہ نقرئی پُل قوسِ قزح کی طرح نیم دائرے کی صورت دریا پر جھکا ہوا تھا اور اس کے عقب میں تھرمل پاور اسٹیشن کی چمنی سے اٹھتا ہوا دھواں اُفق کی سرمئی سلیٹ پر حرارت، حرکت اور حیات کی کہانی لکھ رہا تھا۔

پجاری نے کہا ــــ تم نے تو کمال ہی کر دیا، صبح سے لے کے اب تک تم نے تصویروں کے ڈھیر لگا دیئے، خوب مصوّر ہو ــــ اب تھک گئے ہو گے تھوڑا سستا لو؟

اس نے کہا ــــ تھکاوٹ، کیسی تھکاوٹ؟ کیا تمہیں پوجا کرتے ہوئے کوئی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے، یہ بھی تو ایک عبادت ہے، مجھے یاد نہیں کہ میں یہاں کب آیا تھا اور مجھے یہ سوچنے کی فرصت بھی نہیں، دیکھو ذرا تمہیں یہ تصویریں پسند نہیں کیا، یہ رنگوں کا جہانِ طلسم ــــ! اسی وقت اُسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی، اُس نے مُڑ کے دیکھا، ملّاح سنگِ مرمر کے خاک آلود فرش پر گیلے قدموں سے گُل بوٹے بناتا ہوا آ رہا تھا۔

شام ہو گئی سائیں، وہ قریب آکے بولا، اب چلیں، آپ کا کام ختم ہو گیا ؟

کام اس نے زیر لب دہرایا، کام تو اب شروع ہوا ہے !

پھر اس نے اپنی تصویروں کو غور سے دیکھا اور زور سے کہا ——

تم جاؤ میں یہیں ٹھہروں گا ! یہ کہہ کر اس نے دریا کی طرف دیکھا اور اسے دریا کی بپھری ہوئی موجوں میں اپنی آواز کی گونج سنائی دی، میں یہیں ٹھہروں گا، میں یہیں ٹھہروں گا !

عمارت کی کسی قریبی راہداری سے مسلسل کسی کے چنگ بجانے کی آوازیں آرہی تھیں، اس نے موقلم اٹھایا اور کینوس پر سر جھکا دیا۔

❖

موم جامہ

"اور جو میں کرتا ہوں اس کو نہیں جانتا کیونکہ جس کا میں ارادہ کرتا ہوں
وہ نہیں کرتا بلکہ جس سے مجھے نفرت ہے وہی کرتا ہوں اور اگر اس پر میں
عمل کرتا ہوں جس کا ارادہ نہیں کرتا تو میں مانتا ہوں کہ شریعت خوب
ہے، پس اس صورت میں اس کا کرنے والا میں نہ رہا بلکہ گناہ ہے جو
مجھ میں بسا ہوا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے جسم میں کوئی نیکی
نہیں البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے نہیں بن پڑتے
چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ
نہیں کرتا اسے کر لیتا ہوں۔"

عہد نامۂ جدید

باپ بیٹے اور رُوح القدس کے نام
مقدس باپ بھٹکی ہوئی بھیڑ کو راستہ دکھا
پاک مریم کی قسم ہم بڑے گناہ گار ہیں۔!

سسٹر روزیٹی نے یسوع مسیح کی پیدائش سے متعلق سبق شروع کرنے سے قبل کپکپاتے ہاتھوں سے گلے میں جھولتی صلیب کو چھوا اور اپنی بھیگی ہوئی پلکیں اُٹھا کے کلاس کی جانب دیکھا۔ سارے لڑکے ادب اور احترام سے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے اور ان کی نظریں اپنی کتابوں پر جمی تھیں۔ سسٹر روزیٹی کی نظروں کا پرکار پوری کلاس میں گھوما اور پھر ایک چہرے پر مرکوز ہو گیا۔ اگلی نشست پر بیٹھا ہوا چھوٹا سا لارڈ کاان کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا

تھا۔ اس لڑکے کے چہرے کی معصومیت، اس کی پیشانی کی دمک اور اس کی آنکھوں کی چمک ان کی روح کے آئینے میں اس طرح اتر گئی جس طرح کچی دیوار پر گیلی ہتھیلی کا نشان۔ سسٹر روزیٹی کو لڑکے کے بھولپن پر بے تحاشا پیار آیا یہ لڑکا اس کلاس میں نیا نیا داخل ہوا تھا اور اسے دینی تعلیم کا پریڈ اٹینڈ کرتے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے سسٹر روزیٹی نے بارہا غور کیا تھا کہ جب بھی وہ پڑھنا شروع کرتیں اور راسٹرم کے سامنے کھڑے ہو کر مقدس انجیل کے قصے سناتیں یا یسوع مسیح کے مصلوب مجسمے کے سامنے دو زانو ہو کر دعائیں مانگتیں تو ہر لمحے اور

ہر سمے اس لڑکے کی نگاہیں ان کے چہرے پر جمی رہتیں۔ انہوں نے کئی بار اسے ٹوکا، کئی بار تنبیہہ کی کہ وہ اپنی کتاب پر نظر رکھے۔ مگر لڑکا اپنا سبق ان کے چہرے پڑھتے رہنے کا پابند تھا۔ سب لڑکے دینی تعلیم کے پیریڈ میں قطار بنا کے ادب سے سر جھکائے ہوئے چرچ کے بڑے ہال میں داخل ہوتے اور سسٹر روزیٹی کے سر کے خفیف اشارے سے خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جاتے۔ سسٹر روزیٹی نے غور کیا تھا کہ یہ لڑکا قطار میں سب سے آگے ہوتا اور اسے ہمیشہ اگلی نشست ملتی۔ وہ چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا اور مستقل ان کی جانب دیکھتا رہتا۔ اسکی نظروں میں ایسا پیار اور ایسی وابستگی جھلکتی کہ سسٹر روزیٹی کے لئے خود کو سبق کی جانب مائل کرنا مشکل ہو جاتا۔ حالت یہ ہوتی کہ سبق شروع کرتے، گھومتے، مڑتے، ورق الٹتے، راسٹرم پر کھڑے ہو کر بولتے ہوئے مقدس مریم کے مجسمے کے سامنے دعا مانگتے ہوئے ہر لمحے، جوتے کی کنکر کی چبھن کی طرح انہیں یہ احساس رہتا کہ لڑکے کی نظریں ان کے چہرے، پیشانی اور ان کے ہلتے ہوئے ہونٹوں پر جمی ہوئی ہیں جس کے نتیجے میں ہر بار ان کی نظر غیر ارادی طور پر لڑکے پر جا پڑتی، اس لڑکے کا وجود تو ان کے لئے آئینے کی آنکھ بن گیا تھا جس سے نظر چرانا محال تھا۔

اس وقت بھی لڑکا انہیں تک رہا تھا۔ سسٹر روزیٹی نے چور نگاہوں سے اسے

دیکھا اور ان کے دل میں اس کے لئے پیار کا طوفان اُمنڈ آیا۔ وہی معصوم چہرہ، چمکتی پیشانی، بالوں کی سنہری لٹیں، مسکراتے ہونٹ، بولتی آنکھیں، وہ اپنی ننھی سی ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے بڑی معصومیت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ سسٹر روزیٹی نے سبق پڑھانا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ محسوس کرتی گئیں گویا لڑکے کی نظریں بدستور ان کے گلے کو چوم رہی ہیں ان کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہیں۔ انہوں نے اس کی نظر کے شراروں کو اپنے رخساروں پر مچلتے ہوئے محسوس کیا اور پھر جیسے ان کی آواز کنوئیں سے آنے لگی، کتاب کے حروف دھوئیں کی لکیروں میں مدغم ہونے لگے۔ وہ چاندی کی صلیبوں، سفید لبادے اور گرہ دار رسیوں کو پیچھے چھوڑ کر عجیب و غریب گلیوں کو پار کرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ گئیں جہاں اُن کا وجود خود بخود ایک بچّی کی صورت میں ڈھل گیا۔ سُرخ گالوں والی بھولی بھالی بچّی! انہوں نے خود کو متحرک تصویروں اور تھرتھراتے آئینوں کے بیچ میں پایا۔ ان کا بچپن زندہ ہو گیا تھا چرچ کی ان سنگی دیواروں سے دُور، ایک مضافاتی قصبے کا چھوٹا سا گھر، چھوٹا سا آنگن اور پپیتے کا وہ پیڑ جو ان کے بھائی جوزف نے لگایا تھا انہوں نے خود کو اس پپیتے کے پیڑ کے نیچے بڑے ہوتے ہوئے دیکھا وہ پپیتے کے اس پیڑ سے شرط باندھ کر بڑھ رہی تھیں پھر پپیتے کا پیڑ ایک مقررہ بُلندی پر جا کر رک گیا لیکن وہ بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اُن کے ڈیڈی کے جگری دوست فادر انوسنٹ ایک دن اپنی عینک کو ناک پر کھسکا کے بولے۔

"ونڈرفُل ڈارلنگ یو آر ویری کیوٹ!" پھر انہیں اپنی پیاری ممّی یاد آئیں جو انہیں نہایت پیار کرتیں اور جب لوگ ان کے بھولپن اور رُوپ کا رحسن کی تعریف کرتے تو وہ فخر سے اپنا سینہ پھُلائے انگنی کی چڑیا کی طرح انجانے غرور سے ٹھمک ٹھمک کر چلتیں۔ انہیں بچپن کے کرسمس کی وہ یادگار رات بھی یاد آئی جب خواب میں برف جیسی سفید داڑھی والے سانتا

کلانے انہیں سُنہرا لباس دیا اور چاندی کی ایک خوبصورت صلیب بھی! ان کی آنکھ کھُلی تو سرہانے مختصر سا دُعائیہ پیغام بھی موجود تھا۔ معصوم روزیٹی کے لئے بیشمار دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ، مقدّس باپ تجھ پر فضل کرے اور پاک مریم تجھے ہمیشہ اپنے سائے میں رکھے!"
وہ پیغام پڑھ کر بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے کرسمس کے دن سنہرا لباس پہنا اور چاندی کی صلیب گلے میں لٹکائی اور ہولی فادر کرسمس کو شمالی برف زاروں میں شکریئے کا خط لکھا۔ انٹر کے بعد ڈیڈی کا خیال تھا کہ اپنی پیاری بیٹی کو میڈیکل کالج بھیج دیں تاکہ وہ ڈاکٹر بن کر قوم و ملت کی خدمت کر سکے مگر ممّی کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ ممّی بیچاری عام عورتوں کی طرح بڑی ہی کنزرویٹو تھیں انہوں نے کہا چونکہ اس کی پیدائش مقدس مریم کی منت ماننے پر ہوئی تھی لہٰذا اس پر سب سے پہلا حق مقدّس مریم کا تھا قوم و ملت جائے بھاڑ میں، خاندان کی بہتری اسی میں تھی کہ اسے چرچ کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ مقدس مریم کی پیروی میں ننوں کی سی پاک و صاف زندگی گذارے اور دین کی تبلیغ و ترویج میں معاون بن سکے۔ پھر انہوں نے خود کو گھر سے نکل کر چرچ میں داخل ہوتے دیکھا پھر آئینوں کا رُخ بدلا اور انہوں نے خود کو مقدس مریم کے سنگ مرمر کے مجسمے کے سامنے دو زانو پایا پھر وہ اُٹھیں اور ہاتھ میں نقرئی شمعدان لئے بہت دیر یسوع کی شبیہہ کے سامنے لرزتی رہیں۔
"عظیم باپ کے عظیم بیٹے مجھے گناہوں سے بچا ـــــ!"
گرجا کے بجتے ہوئے گھنٹوں کے تسلسل میں انہوں نے خود کو بہت ہلکا پھُلکا محسوس کیا، سر سے پاؤں تک سفید لبادے میں اُن کا وجود ناپاکی کے ہر امکان سے ماورئی لگ رہا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے انہیں روئی کے گالے کی طرح دھنک ڈالا گیا ہو، انہیں اپنا وجود غیر مرئی سا لگ رہا تھا۔ جیسے اُن کے اندر کا سارا دُھواں نکال لیا گیا ہو۔ انہوں نے خود کو ریشم کا ڈھیر

بنتے محسوس کیا۔ انہوں نے اپنے بدن کو چھونا چاہا لیکن ان کا بدن ان سے چھوٹ گیا تھا، صرف رُوح ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے سفید لبادے میں روشنی کو جمع ہوتے دیکھا اور سرد ہوا کے ایک لطیف جھونکے کو اندر داخل ہوتے محسوس کیا، وہ خوش ہوئیں انہیں ایسا لگا کہ وہ بلند ہو کر ایسے مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں گناہ کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ مقدس مریم نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا اور نئی زندگی کی بشارت دی اور ایک دن جب ایکبار پھر وہ آئینے کے سامنے آئیں تو اپنا سراپا دیکھ کر ٹھٹک گئیں انہوں نے دل میں کہا: میں نے بدن کو پیچھے دھکیل دیا ہے اور گناہوں کی دیوار پھاند آئی ہوں اور سفید لبادے میں صرف روشنی ہے۔ انہوں نے غور سے اپنے چہرے کی صباحت، رخساروں کی دمک اور ہونٹوں کی نازکی کو دیکھا اور سوچا، یہ سفید لبادہ اور گلے کی صلیب اور سیاہ دانوں کی تسبیح، ایسی زنجیریں ہیں جن میں گناہوں کو سختی سے جکڑ دیا گیا ہے انہوں نے نفس کو تقدّس اور طہارت کے پنجرے میں مقید پایا۔ اُن کی رُوح کی نیکی اور مزاج کی پاکیزگی بلیے سفید لبادے میں محفوظ تھی، ان کے اندر کا شیطان بے بس تھا اور اس کے سینے پر چاندی کی صلیب ٹھونک دی گئی تھی۔

وہ سر سے پیر تک سفید لبادے میں ملبوس ایسی موم بتی کی طرح لگتیں جو کبھی جلی ہو نہ پگھلی ہو، ان کا موی وجود گرجا کی سنگی دیواروں میں تقدّس اور طہارت کی علامت بن گیا تھا۔ دینی تعلیم کا پیریڈ ہوتا تو وہ اسکول کے بچّوں کو نہایت محنت اور شوق سے بائبل کے قصّے پڑھاتیں اور انہیں یسوع کا کردار سمجھنے میں مدد کرتیں۔ بچّے ان سے محبّت کرتے، گرجا کے پادری ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتے اور دوسری راہبائیں انہیں رشک سے دیکھتیں، مریم نے پھر سے جنم لیا تھا۔

گرجا کا گھنٹہ زور زور سے بجنے لگا، دینی تعلیم کا پیریڈ ختم ہو گیا تھا انہوں نے کتاب

بند کر دی اور یسوع کے مجسمے کے سامنے دو زانو ہو کر دعائیں مانگنے لگیں لڑکے بھی خاموشی سے دعائیں مانگتے رہے۔ دُعا ختم ہوئی تو گرجا کا دروازہ کھلا، لڑکے قطار کی شکل میں باہر نکلے اور تتلیوں کی طرح احاطے میں پھیل گئے۔

سسٹر روزیٹی کتابوں کی الماری بند کر کے مڑیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سارا ہال خالی ہو چکا تھا لیکن وہ لڑکا اب تک اپنی نشست پر بیٹھا تھا اور اسی طرح اپنی ننھی سی ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سسٹر روزیٹی کو یکلخت اس پر بڑا پیار آیا۔ وہ اس کے پاس گئیں اور محبت سے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں ــــــ "ارے تم نہیں گئے بابا ؟ کوئی کام ہے مجھ سے ؟"

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا اور ٹکر ٹکر ان کی جانب دیکھتا رہا۔ سسٹر روزیٹی مسکرائیں اور اس کے بال سنوار کر بولیں ۔

"اچھا کوئی بات نہیں آؤ میرے ساتھ چلو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا ! "

انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گرجا سے ملحقہ، اپنے کوارٹر میں آگئیں۔ لڑکا سحرزدہ سا ایک طرف بیٹھا رہا۔ سسٹر روزیٹی نے پوچھا ـــ "کہو بیٹے بھوک تو نہیں لگی ؟ ضرور لگی ہو گی آؤ پہلے کچھ کھا پی لیا جائے ؟" ـــ کھانے کے دوران سسٹر روزیٹی نے کئی مرتبہ لڑکے کو بات چیت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر لڑکا یا تو شرما رہا تھا یا انتہائی کم گو تھا وہ ذرا بھی نہ بولا اور محض سر کے اشارے سے ہاں، نہیں کا جواب دیتا رہا۔ وہ سسٹر روزیٹی کو اب بھی ٹکٹکی باندھ کے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی طلسم کا شکار ہو۔ سسٹر روزیٹی نے پیار سے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہنس کر کہا ـــــ "کہو بیٹے میں تمہیں اچھی لگتی ہوں، کیوں ؟"

لڑکے نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا، اس کا چہرہ سُرخ تھا۔ سسٹر روزیٹی

کھکھلا کر ہنسیں۔

"تم تو بڑے پیارے بچے ہو نجانے مجھے تم پر اتنا پیار کیوں آتا ہے، اچھا چائے پیو گے، ٹھہرو میں تمہارے لئے چائے بناتی ہوں!"

چائے بناتے ہوئے وہ دل ہی دل میں بچے کے بھولپن اور اس کے معصوم عشق پر فدا ہوتی رہیں پھر اسے چائے کی پیالی تھما کے یونہی بات چھیڑنے کو بولیں ــــ "اچھا یہ تو بتاؤ تمہیں مجھ میں کیا اچھا لگتا ہے؟"

"پتہ نہیں!" لڑکے نے بھولپن سے جواب دیا اور ہولے ہولے چائے پیتا رہا۔

"واہ میاں واہ!" سسٹر روزیٹی زور سے ہنسیں، وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ سفید لبادے میں ان کا سراپا نہایت پُراسرار لگ رہا تھا گلے میں جھولتی ہوئی صلیب اور کمر کی موٹے دانوں والی سیاہ تسبیح، ان کا حسین چہرہ سفید ہلبوس میں ایسا مقدس لگ رہا تھا کہ وہ خود اپنی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

وہ کچھ حیرت زدہ اور کچھ مرعوب سی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئیں پھر انہوں نے سر پر سے اپنا ہڈ اتارا اور ایک قدم آگے بڑھیں اسی وقت لڑکے نے زور سے چیخ ماری، پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور لڑکا ڈر کے باہر بھاگ گیا۔ چند ثانئے سسٹر روزیٹی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر انہوں نے آئینے میں اپنے گنجے سر کو دیکھا اور ہڈ کو فرش پر پھینک کر وہ یکایک ایسا بلک بلک کے روئیں جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو یا جیسے کسی کو کوئی بھولا ہوا غم یاد آ جائے پھر وہ صلیب چھو کے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگیں۔

ہمارے گناہ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے، ہماری رُوح کا اندھیرا شدید ہے۔

مقدس باپ بھٹکی ہوئی بھیڑ کو راستہ دکھا۔

پاک مریم کی قسم۔!

ہم نے اپنے پیچھے دروازوں کے بند ہونے کی آواز سُنی۔

اور پھر ہم نے زین اوڑھ لی اور اپنے ہاتھوں میں گیہوں کی بالیاں اٹھائے دریا کے ساتھ چل پڑے۔ یہ سفر بڑا طویل ٹھہرا اور سُورج ہمارے کندھوں پر سوار ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

میرے ساتھی نے اپنے سر پر گھر کی چھت اٹھا رکھی تھی لیکن جب بھی ہم دونوں اس سے ذرا دیر کو پُشت ٹکا کر اپنی آنکھوں پر جمتی ہوئی نیند کی پھپھوند صاف کرنے کی کوشش کرتے ـــــ نجانے کہاں سے لمبی پلکوں والے بیشمار پرندے ٹڈی دل کی طرح نمودار ہوتے اور اپنی نوکیلی چونچوں سے ہماری چھت کو اس طرح چھلنی کر دیتے کہ ہم انجیر کے پتوں میں بھی برہنہ ہو جاتے۔ کبھی کبھی میرا ساتھی جھنجھلا کے ان کے پیچھے دوڑ پڑتا اور پھر جب وہ واپس لوٹتا تو کبھی اس کے ہاتھوں اور کبھی اس کی پیشانی سے خون ٹپکتا ہوتا۔

وہ مجھے اپنی محبتوں کے شہر میں قلعہ بند رکھنے کے لئے برسہا برس تک نیزوں کی دیواریں کھڑی کرتا رہا۔ لیکن ایک رات جب میں اس کے بدن کے مخملیں لحاف میں سمٹی ہوئی تھی یک بیک ہمارے سرہانے ایک دیو پیکر راکھشس نے سر ابھارا جو سمندر کی طرف سے آیا تھا، اس کی شکل گھوڑے کی تھی اور اس کے نتھنوں سے تیر نکلتے تھے۔ اس نے اپنی چوبی ٹاپوں سے ہماری چھت کے پرخچے اڑا دیئے۔

میرا ساتھی چھت کی تلاش میں چاروں طرف دوڑتا پھرا اور وہ اتنا دوڑا اور اتنا

بھاگا کر دیوانہ کہلایا۔ پھر جب دیوانگی کے عالم میں اس سے کہا گیا کہ وہ پہاڑ سے اپنے گھر کی چھت تراش لے تو وہ تیشہ اُٹھا کے پہاڑ کی سمت دوڑ پڑا۔ اسی طرح جب ایک مرتبہ میرے اور اس کے درمیان پانی حدِ فاصل ٹھہرا تو مَیں نے گھڑے سے گھوڑے کا کام لیا یہاں تک کہ وہ ہماری رفاقت کی پہچان بن گیا لیکن ایک دن مجھے ایسا بھی یاد ہے جب مجھے عزت والوں کی خوشنودی کے لئے سنگی دیوار کا نقاب اوڑھنا پڑا تھا اس لئے کہ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ میرا ساتھی میری آرزو کا گُرز لے کر سونے کے اس پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے گا جسے دیوتاؤں نے ہم دونوں کے درمیان حائل کیا تھا۔

پھر ایک دن جب ہم دونوں سُورج کی تھکی ہوئی کرن سے ٹیک لگا کے سفر کی لذت کو اپنے بدن کے مرتبان میں ذخیرہ کر رہے تھے، مَیں نے کہا، مُونس اب تو سب بلائیں تمام ہو چکیں کیوں نہ ہم ایک ہو جائیں؟ اکائی ہماری اصل ہے اور ہر شے اپنی اصل کو لوٹتی ہے۔

وہ ہنسا، کہنے لگا! اصل بات یہ ہے جانم کہ مجھے دُنیا میں کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا مگر اپنے والدِ گرامی کی بے بہا مونچھ سے، جس کی نوک پر ان کے وقار کی کائنات قائم ہے، مجھے ڈر ہے کہ ہمیں یکجا دیکھ کے ان کے وقار کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو جائے، ویسے ہی میرا سانولی لڑکیوں سے ملنا جلنا انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا، وہ کہتے ہیں کہ بہو ایسی ہونی چاہیئے جو چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہو تا کہ اس کے دَم سے گھر بھر میں اُجالا ہو جائے، لگتا ہے کہ وہ اپنی بہو کے ذریعے بجلی کی بچت کرنا چاہتے ہیں۔

مَیں نے کہا، ہمارے بڑوں کی باتیں کیسی عجیب ہیں پتہ ہے میری ماں کیا کہتی ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ لڑکے کی ہڈی اچھی ہونی چاہیئے کیونکہ اگر اس کی ہڈی اچھی ہو تو آنے والی نسلوں پر نیکی، خوش نصیبی اور سلامتی نیلا آسمان بن کر اُترتی ہے۔ اب تم بتاؤ کہ مَیں تو ہوں طلائی خاندان

ہے اور تمہارا تعلق ہے نفرتی نسل سے پھر میری ماں کیوں کر ہماری یکجائی برداشت کرے گی؟

اس نے کہا، مگر یہ بھی تو سوچو کہ تم صنف حوا ہو اور میں آدم تو پھر وہ کون ہے جو ہمارے درمیان سرحدیں کھڑی کر رہا ہے؟

پھر ایک شام ہم دونوں بیٹھے تھے کہ اس نے کہا، سنو میری شاعری میں تمہارا دل دھڑکتا ہے، تمہاری آنکھیں بولتی ہیں اور تمہاری سانسیں مہکتی ہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے یقین ہے بلکہ شاید اس کا اوروں کو بھی یقین ہے جبھی تو ہماری تنہائی کی دیواریں چھلنی کی بنی ہوئی ہیں اور چھت کی جگہ وسیع روشندان قائم ہے اور جب ہم باہر نکلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری تصویریں تو سب شہر والوں کے ہاتھوں میں تھمی ہیں اور ان کی سرگوشیوں میں ہمارے ناموں کی تکرار سنائی دیتی ہے۔

اس دن وہ عورت کے حقوق پر زوردار تقریر کر کے آیا تو میں نے اسے عقیدت کے پھول پیش کئے۔ میں نے کہا، تم مجھے اسی لئے پسند ہو کہ تم میں سچائی کے اظہار کی جرأت ہے۔ تمہارا یہ چہرہ مجھے ان عظیم لوگوں کی یاد دلاتا ہے جنہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا۔

اس نے کہا، سنو جب آج میری تقریر کے دوران تم بے تحاشا تالیاں پیٹ رہی تھیں تو بہت سی آنکھیں تمہارا جائزہ لے رہی تھیں اور جب میں تقریر کر کے واپس آ رہا تھا تو راستے میں بہت سے آنکھوں والے ملے اور کہنے لگے تمہاری تقریر نے اُسے بہت متاثر کیا ہے جسے تم متاثر کرنا چاہتے تھے، مبارک ہو، اُمید ہے کہ تمہارا سفر اچھا گزرے گا۔

کون سا سفر؟

"زندگی کا سفر!" انہوں نے جواب دیا۔

میں نے کہا، شاید تمہیں پتہ نہ ہو کہ لمبی پلکوں والے پرندے اب بھی ہمارے چاروں

طرف منڈلا رہے ہیں اور سامنے والی کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے پرے جمائے بیٹھے ہیں۔

پھر بڑی آپا کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔ بھئی بہت رات ہو گئی ہے اب اپنے کمروں میں سو جاؤ۔ میں نے کہا، جی صبح یہ شخص جا رہا ہے لمبے سفر پر، ذرا جی بھر کے باتیں تو کر لوں!

نہیں بی بی، انہوں نے سرگوشی کی، کافی رات ہو گئی ہے، گھر والے کیا کہیں گے، وہ تمہارا منگیتر ہے تو کیا ہوا، تمہیں اس کے ساتھ زیادہ دیر تک اکیلے نہیں رہنا چاہیئے۔

کیوں؟ میں نے سوال کیا۔

بڑی آپا بولیں، بس کہہ جو دیا، لکڑی آگ کے قریب ہو تو کوئی اسے جلنے سے نہیں روک سکتا۔

مگر ہم کوئی بچے تو نہیں؟

یہ اور خطرناک بات ہے جان، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں، شیطان کو کبھی INEFFICIENT نہیں سمجھنا چاہیئے۔

اور پھر جب ایک دن ہماری چھت کو دیواریں نصیب ہوئیں تو میں اور میرا ساتھی بہت ہی خوش ہوئے۔ وہ کہنے لگا، بھئی خوب جگہ ہے۔ صاف ستھری، روشن اور رومانٹک۔ بس اب یہیں رہیں گے لیکن وہ دیواریں بھی بھوسے کی نکلیں جن میں سرگوشیوں کے چوہے پھدکتے پھر رہے تھے۔

نظریں ہمارے وجود کو چاٹ رہی تھیں اور ہماری پُر سکوت تنہائی کو آواز کا گھن لگ چکا تھا۔ میں اپنے چاروں طرف مکھیوں کو بھنبھناتے ہوئے پاتی۔

اری کون ہے یہ؟

پتہ نہیں۔

اور وہ کون ہے؟ اس کا خاوند؟ اس کا چاہنے والا؟
آخر یہ آئے کہاں سے ہیں؟
ذرا دیکھو تو کیسے مگن ہیں ایک دوسرے میں؟
بھئی مجھے تو یہ معاملہ کچھ ـــــ ؟

میں سوچتی ہوں کہ شاید میرے بدن سے ایک انوکھی خوشبو پھوٹتی ہے کہ میں چاہے جہاں رہوں وہ مجھ سے دور نہیں رہ سکتا، اس دنیا میں بھی جو ایک عجیب دنیا ہے، ایسی دنیا جو زمانوں سے پہلے وجود میں آئی۔ یہاں کسی کا کوئی ماضی، کوئی مستقبل نہیں، یہ دنیا صرف اور صرف حال سے منسلک ہے اور ایسا حال جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ یہ حال ہے۔ سب سمجھتے ہیں کہ شاید یہی ماضی ہے، یہی مستقبل ہے۔ میں اس دنیا میں سورج کی حیثیت رکھتی ہوں۔ یہ دنیا میرے وجود سے گرم اور روشن ہے۔ اگر میں سامنے نہ آؤں تو یہ دنیا اندھیری رہے، یہاں دن نہیں نکلتا، میں طلوع ہوتی ہوں۔ یہ دنیا ہجر کی دنیا ہے۔ وصال کی دنیا ہے، روز ہجر اور روز وصال، روز جدائی اور روز ملاپ۔ اگرچہ یہاں رنگ و روپ ہی سب کچھ ہے مگر یہاں کا رنگ ڈھنگ اور ہے۔ وہ میرے طلائی چہرے اور نقرئی آواز سے خوش ہوتا ہے، ہاں خوش ہوتا ہے جبھی تو وہ یہاں آتا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر میں کانسی کا چہرہ لگالوں تو بھی وہ یہاں آئے گا کیوں کہ یہاں چہرے اتنے اہم نہیں، یہاں رنگ بھی کام نہیں آتا۔ یہاں نسل سے بھی کسی کو غرض نہیں۔ یہاں عورت کا صرف ایک نام ہے، ایک رنگ اور ایک نسل۔ اسے تو یہاں میری خوشبو کھینچ کے لاتی ہے۔ پھر آج جب وہ بے جھجک میری سیڑھیوں پر چڑھتا آ گیا تو میں اپنے طلائی چہرے کو کھڑکی میں سجائے کھڑی تھی۔ اس نے آتے ہی بے تکلفی سے میرے چہرے کے روشن چراغ کو بجھا دیا اور مجھے ان دیواروں کے پیچھے لے گیا جہاں چہروں کے نقوش مٹ

جلتے ہیں اور پھر تابناک پیشانیوں اور مسکراتے ہونٹوں پر ایسی تیز خوشبو پھیل جاتی ہے جو عموماً عبادت گاہوں میں پائی جاتی ہے۔ اس خوشبو کی معیت میں ہم دونوں اپنے وجود کے نشانوں سے آگے بڑھ کے ایسے جہانوں کی طرف نکل گئے جہاں زمین اور آسمان رُوئی کی طرح دُھنکے ہوئے تھے اور فضا نیلگوں تھی اور ایک ایسے درخت نے ہم پر سایہ کر رکھا تھا جس کی شاخوں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

اُسی وقت دستک ہوئی، بہت تیز دستک ــــ! پھر بوکھلائی ہوئی آوازیں اُبھریں۔ سنو، سنو باہر قانون کے محافظ آ گئے ہیں۔

مَیں نے اس کی طرف دیکھا، اب کیا ہو گا؟

وہ مسکرایا، جو گنہگاروں کا ہوتا ہے۔ کیا تو نے غور نہیں کیا کہ ہم ننگے ہیں، پس خود کو انجیر کے پتوں کے سپرد کر دو، بیشک ہم نے وہ پھل کھایا جس کی بابت منع کیا گیا تھا کہ نہ کھانا۔

اس وقت باہر بہت ہنگامہ تھا، محافظوں کی سیٹیاں گونج رہی تھیں اور ہمیں وہاں سے نکلنا تھا کیونکہ اوپر سے فرمان آ چکا تھا کہ بس اب زمین پر اُتر پڑو، اے آدم و حوّا!

ہم نے اپنے پیچھے دروازوں کے بند ہونے کی آواز سُنی۔

نام : نجم الحسن رضوی

والدہ کا نام : سجاد حسین

پیدائش : ۲۳ اپریل ۱۹۴۴ء بمقام دیو گام، ضلع اعظم گڑھ (یوپی)، بھارت

مستقل سکونت و تحصیلِ علم : سکھر، حیدرآباد، کراچی

تعلیم : ایم اے (صحافت)
ایم اے (اردو ادب)

پیشہ : تعلقاتِ عامہ اور صحافت

اوائل عمری سے لکھنا شروع کیا، یہیں بھرپور محبت افسانے سے، لیکن نثر کی دیگر اصناف سے بھی چھیڑ چھاڑ کا شوق، طنز و مزاح سے بچپن کی بے تکلفی، تنقید سے آشنائی اور ڈرامے سے دُور کی شناسائی۔

افسانوں کا پہلا مجموعہ "چشمِ تماشا"، آنے والی کتابیں، افسانوں کا دوسرا مجموعہ "کانچ کا آسمان"، طنزیہ مضامین کا مجموعہ "اردو ادب کا جغرافیہ" اور افسانے پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ "افسانے کا سفر"۔

سرورق : حمید ساغر، پریس : نیو پکٹوریل پریس راولپنڈی